سلسلۂ نصابیات علمیہ جامعہ عثمانیہ

برطانوی ہند کا نظام سیاسی

تصنیف

ای۔ اے۔ ہارن آئی۔ ای۔ ایس

ترجمہ

مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی

سنہ ۱۳۵۰ھ سنہ ۱۳۴۰ف سنہ ۱۹۳۱ء

دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی اجازت سے
جس کو حق اشاعت حاصل ہے اردو میں ترجمہ کرکے
طبع و شائع کی گئی ہے

فہرست مضامین

برطانوی ہند کا نظام سیاسی

دیباچہ

برطانوی ہند کے سیاسی نظام کا یہ تمہیدی خاکہ جس میں ۱۹۱۹ء کی دستوری تبدیلیوں پر خاص طور سے اظہار خیال کیا گیا ہے، ان تقریروں پر مبنی ہے جو مصنف نے بہار ۱۹۲۰ء میں جامعہ ہارورڈ میں کی تھیں۔

چونکہ یہ کتاب طلبہ کے لیے ترتیب دی گئی ہے کہ ایک طرف تو یہ اس موضوع پر تمہیدی مواد بہم پہنچاتی ہے، اور دوسری طرف البرٹ کی "حکومت ہند" اور اسٹریچی کی "ہندوستان" جیسی مستند نصابی کتابوں کے ضمیمہ کا کام دیتی ہے، اس لیے موخر الذکر خیال کے ماتحت اس کتاب میں ہندوستان کے جدید آئین کو باب (۲) میں بیان کیا گیا ہے۔

تاہم اس وقت یہ موضوع محض علمی دلچسپی سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، ہندوستان کی حکومت خود اختیاری کا منشور دراصل اس عالمگیر جنگ کا لازمی نتیجہ ہے جو آزادی جمہوریت کے لیے تھی اور حال ہی میں ختم ہوئی ہے، اور جو لوگ بعد از جنگ کے بندوبست سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ منشور قابل مطالعہ ہے، ایسے ناظرین کی توجہ پہلے باب کی طرف جس میں ایک عام خاکہ پیش کیا گیا ہے، خاص طور سے مبذول کرائی جاتی ہے۔

ان تقریروں اور اس کتاب کی اشاعت میں ایک سال کا وقفہ ہو گیا ہے، اور اس وجہ سے یہ بات ممکن ہو گئی ہے کہ اس میں ایک ایسے باب (بابی) کا اضافہ کیا جائے، جس میں اصلاح شدہ دستور کی عملی صورت پر اظہار خیال کیا گیا ہو، اور اس کے ساتھ ہندوستان کی انقلابی تحریک کے حالیہ مظاہروں پر

بحث کرنا بھی ممکن ہوگیا ہے۔ جن لوگوں نے گزشتہ بارہ مہینوں میں اہم ترین واقعات کا مطالعہ کیا ہے، ان کے لئے یہ مظاہرے منظم آئینی ترقی کے لئے بڑا خطرہ ہیں، باب ۷، اسی موضوع پر مشتمل ہے،

سینٹ انڈریوز
۱۵۔ اپریل ۱۹۲۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برطانوی ہند کا نظام سیاسی

باب (۱)

ایک سرسری نظر

(۱)

آج سے تقریباً تین صدی قبل پہلی انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جسے ملکہ الزبتھ نے سولھویں صدی کے آخری دن منشور عطا فرمایا تھا، ہندوستان میں اپنی کوٹھیاں، یا تجارتی مرکز قائم کئے جیسا کہ اکثر کہا گیا ہے الزبتھ نے لندن کے تاجروں کے گورنر اور کمپنی کو جو مشرقی جزائر ہند میں تجارت کرتی تھی جو فرمان عطا کیا تھا، وہ اپنے نظام حکومت خود اختیاری میں، چارلس اول کے اس فرمان سے بہت مشابہ تھا جو اس نے "انگلستان جدید" میں خلیج میساچوسٹس کی کمپنی اور اس کے گورنر کو عطا کیا[۱] تھا، اس فرمان کے ذریعے سے ایک گورنر ایک منتخب مجلس عاملہ دکورٹ آف ڈائرکٹرس

---

[۱] البرٹ گورنمنٹ آف انڈیا (حکومت ہند) صفحہ ۱۰؛ بہرکیف یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا منشور اُس عہد کے استعماری فرمانوں سے اس حیثیت سے عملاً بہت مختلف تھا مثلاً موخر الذکر فرمانوں میں جہاں کمپنی کو نہ صرف اپنے ملازمین کے متعلق بلکہ مقبوضہ علاقہ کے متعلق بھی قانون سازی کے حقوق حاصل تھے، اول الذکر میں اس قسم کا کوئی حق علاقہ پر حکومت کرنے کا نہیں تھا۔

یا کورٹ آف کمپنیز جیسا کہ وہ پہلے کہلاتی تھی) اور ایک جماعت مقننہ (جنرل کورٹ کے قیام کے حقوق حاصل ہوئے تھے) جو ان تمام اشخاص پر جو کمپنی کی ملازمت سے آزاد تھے مشتمل ہوتی تھی اور یہ ایسا دستور تھا جو تجارتی و سیاسی دونوں اغراض کی تکمیل کے لئے قائم کیا گیا تھا اور یہ دستور کمپنی کے بحری کاروبار اور سمندر پار کی نوآبادیوں کے مناسب حال دفعات کے تحت اندرونی نظام حکومت پر مشتمل تھا۔

کمپنی کے اولین مستقل کارخانے سنہ ۱۶۱۱ء میں ہندوستان کے مشرقی ساحل پر مچھلی بندر میں اور سنہ ۱۶۱۲ء میں مغربی ساحل پر سورت میں قائم ہوئے یہ محض تجارتی گودام تھے جن میں مزید حفاظت کے لئے کمپنی کے ملازم ایک فوجی نظام کی طرح اپنے دفتروں اور گوداموں سے قریب ہی رہتے تھے، چونکہ برطانوی حکومت کے نمونے پر کمپنی کے معاملات کا انتظام بھی ایک صدر اور ایک مجلس عاملہ پر مشتمل ہوتا تھا جو ہر پریسیڈنسی کی کمپنی کے پرانے تاجروں سے مرکب ہوتی، اس لئے مخصوص مرکز جن کے تحت متعدد چھوٹے چھوٹے کاروبار ہوتے تھے پریسیڈنسی کہلاتے تھے، اس زمانے میں ہندوستان پر مغل بادشاہ حکمراں تھے جن کے آباؤ اجداد افغانستان و مشرقی ترکستان سے آئے تھے۔ اس مخصوص مغل خاندان کے فتح ہند کی ابتدا سنہ ۱۵۲۶ء میں بابر نے کی اور اس کا استحکام اکبر اعظم نے (سنہ ۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) کیا چنانچہ بہت دنوں تک کمپنی مغل علاقوں میں مغلوں کی اجازت سے صرف تجارتی کاروبار ہی پر قانع رہی۔

بہرکیف سنہ ۱۶۳۹ء میں شہر مدراس کے قیام سے کمپنی کی تاریخ کے ایک جدید باب کا آغاز ہوتا ہے اس باب کو اس کے ماقبل عہد سے جبکہ کمپنی کے پاس ایک چپہ بھر زمین بھی نہ تھی اور اس کے مابعد زمانے سے ممتاز کرنے کے لئے جبکہ یہ چھوٹی سی نوآبادی بڑھتے بڑھتے ہندوستان کی وسیع حکومت بن گئی باب استعمار کہا جاسکتا ہے وہ حصہ زمین جس پر قلعہ سنٹ جارج بنایا گیا تھا کمپنی کی اولین ملکیت ارضی تھی، اس کے گرد مدراس کا شہر آباد ہوگیا، اور وہ سنہ ۱۶۵۳ء میں ایک مستقل پریسیڈنسی بنادیا گیا، اگرچہ اس نئے شہر میں بیشتر ہندوستانی ہی آباد تھے۔ پھر بھی اس کی ایک نوآبادی کی حیثیت تھی۔ کمپنی کو جس چیز نے مخصوص طور سے

اس کام کے لئے جو حقوق عطا فرمائے تھے اُن کے ذریعے سے ۱۶۸۶ء[1] میں مدراس کو انگریزی طرز کی شہری حکومت بھی عطا کی گئی، یہ حکومت ایک میر بلدہ اور ۱۲ الڈرمین پر مشتمل تھی جن میں انگریز، پرتگالی، اور دیسی تینوں شریک تھے، میر بلدہ اور اس کے رفقا کو دیوانی اور فوجداری اختیارات حاصل تھے، ساتھ ہی ان کے سپرد ایک مدرسہ اور قید خانہ رکھنا بھی تھا اور مقامی طور سے محصول لگانے کا بھی حق حاصل تھا۔ کلکتہ کا شہر بھی جو ۱۷۷۳ء سے ۱۹۱۱ء تک حکومت کا دار السلطنت رہا ۱۶۹۰ء میں انہیں حالات کے تحت ایک ایسی جگہ پر جہاں چند معمولی دیہات تھے، آباد کیا گیا، ۱۷۰۷ء میں کلکتے کو بنگال میں قلعہ ولیم کی پریسیڈنسی کی حیثیت سے مستقل صوبہ بنایا گیا۔ وہ جزیرہ جس پر شہر بمبئی آباد ہے ۱۵۳۴ء میں پرتگالیوں کو دیا گیا تھا، ۱۶۶۱ء میں جزیرہ چارلس دوم کو کیتھرائن شاہزادی برگنزا سے شادی کرنے پر بطور جہیز کے ملا اور اس طرح اس کی ملکیت ہو گیا، اُس نے ۱۶۶۸ء میں اسے دس پونڈ سالانہ کے لگان پر، یا اگر اس عہد کی عجیب و غریب عدالتی زبان میں ادا کیا جائے تو "علاقۂ کینٹ میں مشرقی گرینوچ کے خطے کی طرح آزادانہ اور معمولی پٹے پر" ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیدیا۔ بمبئی میں کمپنی نے حقیقۃً مرکزی حکومت کے تحت ایک نو آبادی کی حیثیت سے پوری حکومت قائم کی اور ۱۶۷۶ء کے ایک سرکاری مراسلے میں اسے ایک "نو آبادی" کا لقب دیا گیا ہے۔[2] اس شہر نے نہایت تیزی سے ترقی کی، اور سورت کے صدر اور بمبئی کے اولین گورنر جیرلڈ اونجیر (۱۶۶۹ء …) کے رواداران اور روشن عہد میں یہاں کی آبادی دس ہزار سے ساٹھ ہزار ہو گئی، اونجیر نے شہر کو مستحکم کیا، عدالتیں، محکمۂ پولیس، اسپتال، اور قید خانہ قائم کیا اور آخرکار ۱۶۸۷ء میں مغربی پریسیڈنسی سورت سے بمبئی منتقل کر دی گئی۔

اس طرح اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس بمبئی اور کلکتہ، ان تین مستحکم اور قلعہ بند مقاموں کی مالک تھی جن میں سے ہر ایک مقام

---

[1] رابرٹس ہندوستان کا تاریخی جغرافیہ حصہ اول صفحہ ۱۸

[2] " " " " صفحہ ۶۷

دوسرے مقام کے بلکہ "ملکی حکومتوں" کے اثر سے بھی عملاً آزاد تھا اُن میں سے ہر ایک مقام اپنے حلقۂ عمل کے اندر اور صدر اور مجلس عاملہ کی مقامی ہدایت کے مطابق ہندوستان میں کمپنی کی تجارتی کوٹھیوں کا مرکز بن گیا۔ یہ آبادیاں بظاہر نوآبادیوں کے نمونوں پر تھیں، اور نہ عہد "بحالی شاہی" (۱۶۶۰ء تا ۱۶۸۸ء) میں شاہی منشوروں کی رو سے جو حقوق انھیں ملے، وہ (جیسا کہ البرٹ کا خیال ہے) دراصل کمپنی کی ایک تجارتی مجلس سے وسیع عدالتی و فوجی مقتدر اعلیٰ کے درجے تک ہند ترقی کے مظہر ہیں[۱] دوسری طرف تینوں پریسیڈنسیوں میں کمپنی کے اختیارات کچھ ایک ہی طرح کے تھے، لیکن اس وقت تک اس نے بمبئی کے علاوہ کہیں دوسری جگہ حق حکومت کا دعویٰ نہیں کیا تھا یہ ضرور ہے کہ ۱۶۸۹ء میں لندن کی بزدل مجلس عاملہ نے سرجان چائلڈ کی (جو ۱۶۸۱ء سے ۱۶۸۸ء تک چار مرتبہ گورنر ہوچکا تھا) پرزور تحریک پر اس بات کا اعلان کیا تھا کہ اب کمپنی کی حکمت عملی یہ ہوگی کہ وہ ایسا دیوانی و فوجداری نظام قائم کرے "اور اس قدر وسیع آمدنی پیدا اور حاصل کرے جو مستقبل میں ہندوستان کے اندر ایک "وسیع مضبوط دائمی انگریزی حکومت کی بنیاد ثابت ہو" البتہ چائلڈ نے اس حوصلہ زا حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۱۶۸۵ء میں شہنشاہ اورنگ زیب سے بیکار ایک چھوٹی سی لڑائی مول لے لی اگر ان کی بحری قوت مضبوط نہ ہوتی تو انگریز اسی وقت یقیناً ہندوستان سے باہر نکال دیئے گئے ہوتے یہ خطرہ مشکل سے گذرا ہی تھا کہ ۱۶۸۹ء کے انگریزی انقلاب کی وجہ سے جو سیاسی گتھیاں پڑ گئی تھیں، ان سے یہ خوف پیدا ہوگیا تھا کہ بہت جلد دو حریف ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے نفاق کی وجہ سے ہندوستان سے انگریزی تجارت کا سلسلہ بالکل منقطع ہوجائے، چنانچہ ۱۷۰۲ء میں یہ دونوں کمپنیاں باہم مخلوط کردی گئیں۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا اور اس کے بعد مغل حکومت کا شیرازہ نہایت تیزی سے منتشر ہونے لگا۔ ۱۷۴۶ء میں فرانسیسیوں نے جنگ تخت نشینی آسٹریا کو ہندوستان تک وسعت دے کر مدراس پر قبضہ کرلیا لیکن یہ بالآخر ۱۷۴۸ء میں

---

[۱] البرٹ صفحہ ۱۸

صلح نامۂ ایکس لاشاپل کے مطابق لوئسبرگ کے عوض واپس مل گیا۔ ۱۷۵۶ء میں بنگال کے نوجوان نواب سراج الدولہ نے انگریزوں سے اعلان جنگ کر کے ان کو کلکتے سے نکال دیا یہ اُن کے لئے نازک ترین وقت تھا، ٹھیک اسی وقت انگریزوں نے رابرٹ کلائیو کی مردانہ رہنمائی میں حقیقی حکومت کے لئے عملی قدم رکھا، ہفت سالہ جنگ کے پہلے ہی وہ جنوبی ہند میں فرانس کو نیچا دکھا چکے تھے، انھوں نے فرانس کے نامزد کردہ نواب کو ہٹا کر ۱۷۵۵ء میں کرناٹک میں اپنے نامزد کردہ نواب کو تخت حکومت پر بٹھایا اور اس کے دو سال بعد فرانسیسی گورنر جنرل نہایت ذلت کے ساتھ ہندوستان سے روانہ ہوا، کلائیو نے جنوری ۱۷۵۷ء میں کلکتے پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور جون میں پلاسی کی فیصلہ کن جنگ میں فتح یابی حاصل کر کے ہندوستان کے سب سے زیادہ زرخیز صوبے کا عملاً مالک بن گیا۔

بنگال میں اب گویا نراج (طوائف الملوکی) شروع ہوئی، ایک طرف تو کمپنی اپنے کندھوں پر حکومت کا بار لینے پر راضی نہ تھی اور دوسری طرف اس نے خودساختہ نوابوں کے واسطے بھی حکومت کرنا ناممکن کر دیا تھا، حتیٰ کہ اُس وقت بھی صورت حال کچھ بہتر نہیں ہوئی جب کہ ۱۷۶۵ء میں کمپنی نے بہت زیادہ تذبذب کے بعد مغل بادشاہ سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کی، ابتدائی مغل بادشاہوں کے عہد میں ہر صوبے کا نظام دو شخصوں پر منقسم تھا جن میں ایک افسر دیوان کہلاتا تھا اور مالگزاری اور دیوانی عدالت کا ذمہ دار ہوتا تھا، اور دوسرا نواب ناظم، فوجداری عدالتوں اور پولیس کا ذمہ دار تھا لیکن زمانۂ مابعد کے بنگال کے نوابوں نے دونوں حقوق غصب کر لیے تھے کمپنی کو دیوانی عطا ہونے کی وجہ سے جو دوعملی حکومت قائم ہوگئی تھی اس میں اگرچہ اصولاً کوئی چیز مختلف فیہ نہ تھی، لیکن عملاً وہ بہت بری ثابت ہوئی اس جدید نظام کے بعد جو نواب (گو برائے نام ہی) امن و انصاف کا ذمہ دار مقرر کیا جاتا تھا، وہ کمپنی کے ہاتھ میں ایک بے ضرر کھلونا ہوتا تھا، اُس کے ساتھ ہی ساتھ کمپنی جو اصلاحاً صرف دیوانی معاملات کی ذمہ دار تھی، ملکی ذرائع سے اپنے فرائض انجام دیتی رہی ۱۷۷۲ء تک یہ پورا زمانہ گویا ایک ارتقائی عہد تھا جس کے دوران میں کمپنی ملکی حکومت کے حصول کے لئے تدریجاً اپنا راستہ صاف کر رہی تھی۔

۱۷۷۲ء میں کمپنی نے خود دیوان کی حیثیت سے اپنے اختیارات کو وسیع کرنے کا ارادہ کرلیا اور وارن ہسٹنگز ان ہدایات کے ساتھ بنگال کا گورنر مقرر کیا گیا کہ موجودہ دیسی نظام کی جگہ ایک نیا نظام قائم کردے۔ چنانچہ کمپنی کی "سول سروس" کو تسلیم کیا گیا اور حکام کے عدالتی و مالی فرائض کی انجام دہی کی ہدایت کے لئے مناسب حال قوانین وضع کئے گئے، وارن ہسٹنگز کو کلائیو کی طرح اپنے اصلی مقاصد کے اظہار کے لئے کسی سیاسی عذر کی ضرورت نہ تھی، چنانچہ جیسے ہی اس نے نئے نظام حکومت کی بنا ڈالی ویسے ہی اس نے ایک طرف تو برائے نام مغل شہنشاہ کا خراج بند کردیا اور دوسری طرف نواب کو پنشن دے کر الگ کردیا۔ اب تمام دنیا کو یہ معلوم ہوگیا کہ انگریز عملاً صوبہ بنگال کے حاکم ہوگئے جو (بہار کو ملا کر) رقبے میں تمام جزائر برطانیہ کے برابر اور آبادی میں (۱۷۷۰ء کے تباہ کن قحط سے پہلے) ان جزائر کی اس وقت کی آبادی سے دونی آبادی پر مشتمل تھا۔ ۱۷۷۳ء میں پارلیمنٹ نے انقلاب بنگال کو ایک "امر مسلمہ" تسلیم کرکے اور اپنے دامن کو اس نظری بحث میں الجھائے بغیر کہ برطانوی تاج کی مرکزی حکومت کہاں تک کمپنی کی ملکی حکومت کے اختیارات کو محدود کرسکتی ہے یا مغل بادشاہ کی (جس کے نام و نشان کے سکے کمپنی ۱۸۲۵ء تک ڈھالتی رہی) خیالی حکومت کا لحاظ کیا جاسکتا ہے، ایک قانون کے ذریعے سے کمپنی کے ان جدید اختیارات کی تصدیق کردی۔ اسی سال لارڈ نارتھ کی وزارت نے جو قانون تنظیم (ریگولیٹنگ ایکٹ) منظور کیا اس کے ذریعے سے ان جدید علاقوں کی حکومت کے لئے ایک گورنر جنرل اور چار ارکان کی (جن کے نام اسی قانون میں مذکور تھے) ایک مجلس عاملہ کا تقرر کردیا گیا۔ اس طرح یہ معلوم ہوگیا کہ ۱۶۹۸ء سے بعد کے قوانین اور ان کے تحت عطا شدہ منشوروں کے ذریعے سے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کی برطانوی کوٹھیوں کے انتظام کے لئے ملکی و فوجی حقوق عطا ہوئے تھے، لیکن ۱۷۷۳ء کے قانون نے برطانوی ہند کے وسیع مقبوضات کی حکومت کا سامان (کمپنی ہی کے وساطت سے) مہیا کردیا۔ اس قانون سے نئے سلسلے کا شروع ہوگیا اور ہم کو ۱۷۷۳ء (یعنی ڈیڑھ سو سال کے اندر ہی اندر سے) برطانوی ہند کی دستوری تاریخ کا آغاز کرنا چاہئے۔

(۴)

میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں ان مدارج کو بیان کروں جو بنگال میں مغل حکومت کے خاتمے سے شروع ہو کر ہندوستان کے وسیع براعظم کے دو ثلث حصوں کو بلاواسطہ برطانوی حکومت اور بقیہ ایک ثلث کو برطانوی شہنشاہی کے تحت لے آتے ہیں۔ تاہم یہ بہتر ہو گا کہ ہم اس ہندوستان کے سیاسی حالات کے متعلق ایک عام خاکہ اپنے ذہن کے سامنے پیش کر دیں جو اس دو عملی طریقے سے عالم وجود میں آ گیا جس کے ذریعہ سے ایک طرف تو برطانوی صوبوں کی تعمیر ہوئی اور دوسری طرف اس عجیب و غریب سیاسی پیوندکاری کی جو اب دیسی ریاستوں پر مشتمل ہے، مستقل صورت پیدا ہوئی۔ ایک نقشہ (کتاب کے آخر میں) منسلک کیا گیا ہے جو ہندوستان حکومت کی سیاسی تقسیم کو بتاتا ہے۔ ہم ذیل میں وہ واقعات مندرج کرتے ہیں جن کی مدد سے مجمل خاکہ پڑھنے والے کے سامنے آ جائے گا:

صوبہ	آبادی (۱۹۲۱ء)	طریقہ ترتیب
۱۔ مدراس	۴۲۳۰۰۰۰۰	اٹھارھویں صدی کے وسط کی فرانسیسی جنگوں کے نتیجے میں جنوبی ہندوستان کے اضلاع میں شامل ہو گئی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں میسوری جنگوں کی وجہ سے اضلاع مغربی و شمالی بھی برطانوی حکومت میں شامل ہو گئے۔
۲۔ بنگال	۴۶۷۰۰۰۰۰	۱۷۶۵ء میں بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی منظوری پر یہ علاقے قبضے میں آ گئے تھے۔ ان میں ۱۷۷۵ء
۳۔ بہار و اڑیسہ	۳۴۰۰۰۰۰۰	میں (اودھ سے علیحدگی کی وجہ سے) صوبہ بنارس کا اس میں اضافہ ہو گیا۔ یہ برائے نام "عطا و فتح کردہ
۴۔ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ	۴۵۹۰۰۰۰۰	صوبے" (جو اب صوبہ آگرہ کہلاتے ہیں) کچھ تو اُن اضلاع پر جو ۱۸۰۱ء میں اودھ کے نواب وزیر نے دیئے تھے، اور کچھ اُن اضلاع پر جو ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگ مرہٹہ کے بعد ہاتھ لگے تھے مشتمل تھے۔
[یہ برائے نام عطا و فتح کردہ صوبے جن پر ابتداءً گورنر جنرل حکومت کرتا تھا ۱۸۳۵ء میں صوبجات شمال و مغربی کی مستقل حکومت کے ماتحت کر دیئے گئے، ۱۸۷۷ء میں صوبجات شمالی و مغربی کے لفٹنٹ گورنر اور اودھ کے چیف کمشنر کا عہدہ مدغم		

کر دیا گیا اور ۱۹۰۲ء میں وہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کا لفٹنٹ گورنر بنایا گیا؛ واضح ہو کہ ۱۹۰۱ء کے مقرر کردہ صوبۂ سرحدی، شمالی جنوبی کے ساتھ مشابہت سے بچنے کے لئے دوبارہ یہ نام دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) پر نظر ثانی کرتے وقت صوبۂ بہار اڑیسہ ایک نئی مستقل حکومت کے تحت کر دیا گیا]۔

اسی سال اڑیسہ خاص کے متعدد اضلاع بھی مرہٹوں سے چھین کر دوبارہ بنگال میں شامل کر دیئے گئے، اودھ کو سخت ترین و مسلسل بد انتظامی کی وجہ سے ۱۸۵۶ء میں ملحق کر لیا گیا۔

۵۔ بمبئی ۱۹۳۰۰۰۰۰

[عدن کی نو آبادی کی تاریخ ۱۸۳۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ اور وہ زمانۂ حال تک حکومت بمبئی کے تحت تھا۔ ۱۹۱۸ء میں یہ برطانوی دفتر خارجیہ کے تحت منتقل کر دیا گیا، اور اب تجویز ہے کہ اسے دفتر نو آبادیات کے محکمۂ مشرق وسطیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔]

یہ زیادہ تر پیشوا کے ان علاقوں پر جو ۱۸۱۸ء کی تیسری مرہٹہ جنگ کے خاتمے پر ملحق کئے گئے ہیں مشتمل ہے۔ سندھ کا تحتانی صوبہ (آبادی ۳۳۰۰۰۰۰) ۱۸۴۳ء میں فتح ہوا، اور بمبئی پریسیڈنسی میں ملا دیا۔

۶۔ آسام ۶۰۰۰۰۰۰

[۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۴ء تک گورنر جنرل ۱۸۵۴ء سے ۱۸۷۴ء تک بنگال کے لفٹنٹ گورنر ۱۸۷۴ء سے ۱۹۰۵ء تک ایک مستقل صوبہ کی حیثیت سے ایک چیف کمشنر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک مشرقی بنگال و آسام کے لفٹنٹ گورنر اور ۱۹۱۲ء سے ایک مرتبہ پھر ایک مستقل صوبے کی حیثیت سے ایک چیف کمشنر (اب گورنر) کے زیر حکومت رہا ہے۔]

اس کا ۱۸۲۶ء کی پہلی جنگ برما میں الحاق کیا گیا۔

۷۔ پنجاب ۲۰۰۰۰۰۰۰

[۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۳ء تک تین کمشنروں کی

۱۸۰۹ء میں جمنا اور ستلج کا درمیانی علاقہ (ریاست ہائے اینڈ دے شلج) رنجیت سنگھ

کی مجلس ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۹ء تک ایک چیف کمشنر اور ۱۸۵۹ء سے ایک لفٹنٹ گورنر (اب ایک گورنر) کے تحت ہے)		نے منتقل کر دیا ۱۸۴۶ء میں پہلی جنگ سکھان کے خاتمے دوآبہ جالندھر (ستلج و بیاس کا درمیانی علاقہ) ملحق کیا گیا اور ۱۸۴۹ء کی دوسری جنگ سکھاں کے خاتمے تک پورا صوبہ ملحق کر لیا گیا ۱۹۰۱ء میں دریائے سندھ کے اس پار والے سرحدی اضلاع ایک چیف کمشنر کے تحت کئے گئے اور اس کا ایک مستقل صوبہ یعنی صوبہ سرحد شمالی و جنوبی بنا دیا گیا۔
۸۔ صوبۂ متوسط (اور برار)	۱۳۹۰۰۰۰۰	۱۸۱۷ء کی تیسری جنگ مرہٹہ کے خاتمے پر شمالی اضلاع ملحق ہو کر علاقۂ ساگر و نربدا کی حیثیت گورنر جنرل کے ایک قائم مقام کے تحت کر دیئے گئے اس کے بعد ان کو ممالک شمال و مغربی کے ساتھ ملا دیا گیا مگر ۱۸۶۱ء میں صوبۂ متوسط بنانے کے لئے علاقۂ ناگپور کے ساتھ ملا دیا گیا جو ۱۸۵۳ء میں اصول بازگشت کے ذریعے سے ملحق کر دیا گیا تھا جب ۱۹۰۲ء میں برار (آبادی ۳۱۰۰۰۰۰) کا جس کی آبادی اکتیس لاکھ ہے اعلیحضرت حضور نظام نے مستقلاً برطانوی حکومت کو پٹہ پر دے دیا تو وہ بھی صوبۂ متوسط کے چیف کمشنر (اب گورنر) کے تحت ہو گیا۔
۹۔ برہما (ابتداءً زیریں برہما گورنر جنرل کے قائم مقام کے زیر حکومت تھا ۱۸۶۲ء میں ایک چیف کمشنر مقرر کیا گیا اور ۱۸۹۷ء میں برہما ایک لفٹنٹ گورنر کے تحت کر دیا گیا اب یہاں گورنر حکمراں ہے۔	۱۳۲۰۰۰۰۰	وہ علاقے جو برطانوی یا زیریں برہما کہلاتے تھے (جو ساحلی علاقہ اور پیگو پر مشتمل ہے) ۱۸۲۶ء اور ۱۸۵۲ء کی پہلی اور دوسری جنگ ہائے برہما میں حاصل ہوئے تھے۔ برہما کی خود مختار سلطنت کا (جسے بالائی برہما بھی کہتے ہیں) ۱۸۸۵ء کی تیسری جنگ کے بعد الحاق کر لیا گیا۔

ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل چند اور صوبے بھی ہیں ان میں سے ہر ایک پر حکومت

ہند کی طرف سے ایک چیف کمشنر حکومت کرتا ہے، انڈمان و نیکوبار کے جزائر پورٹ بلیر کی جرائم پیشہ آبادی کا سپرنٹنڈنٹ، کورگ میں میسور کا رزیڈنٹ اور برطانوی بلوچستان و علاقۂ اجمیر و مارواڑ میں گورنر جنرل کا قائم مقام حکومت ہند کا نائب ہوتا ہے۔

صوبہ	آبادی	طریقۂ ترتیب
۱۔ صوبۂ سرحدی شمالی و غربی	۲۲۵۰۰۰۰	۱۹۰۱ء میں پنجاب سے الگ کیا گیا۔
۲۔ برطانوی بلوچستان	۴۲۲۰۰۰	۱۸۷۶ء میں کوئٹہ آباد کیا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں برطانوی بلوچستان ہندوستان کے ساتھ ملا دیا گیا۔
۳۔ اجمیر مارواڑ	۴۹۶۰۰	۱۸۱۸ء میں گوالیار نے حوالہ کر دیا۔
۴۔ کورگ	۱۶۴۰۰۰	۱۸۳۴ء میں بدانتظامی کی وجہ سے ملحق کر لیا گیا۔
۵۔ جزائر انڈمان نکوبار	۲۷۰۰۰	جزائر انڈمان پر ۱۸۵۸ء میں اور جزائر نیکوبار پر ۱۸۶۹ء میں قبضہ ہوا ۱۸۷۲ء میں اُن دونوں مجمع الجزائر کو ایک چیف کمشنر کے تحت متحد کر دیا گیا۔
۶۔ دہلی	۴۸۶۰۰۰	۱۹۱۲ء میں دارالسلطنت کے کلکتے سے دہلی تبدیل ہونے کے وقت ایک چیف کمشنر کے تحت، ایک نیا "انتظامی علاقہ" بنا دیا گیا۔

اس طرح بڑے صوبوں کی آبادی تقریباً ......۲۴۴ اور ۶ چھوٹے صوبوں کی ......۴، اس طرح برطانوی علاقہ کی آبادی کی مجموعی تعداد ......۲۴۷، ہوتی ہے دیسی ریاستوں کی ......۷۲، آبادی اس کے علاوہ ہے گویا اس طرح تمام ہندوستان کی آبادی ......۳۱۹ ہے۔

اصطلاحاً اگر ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی تعریف کی جائے تو یہ ہوگی کہ وہ کسی ایسے ملکی حکمرانوں یا رئیسوں کا حضور شہنشاہ معظم کے زیر حکومت علاقہ ہے جن میں گورنر جنرل یا اس کا کوئی زیر دست افسر شہنشاہ ہند کی قائم مقامی کرتا ہے، اس لئے دیسی ریاستیں، ہندوستان کی ہمسایہ ریاستوں یعنی نیپال و بھوٹان، تبت اور افغانستان سے بالکل مختلف انواع ہیں کیونکہ اگرچہ حکومت ہند بھوٹان وغیرہ سے مصالحانہ تعلقات رکھتی ہے لیکن اُن پر عملاً اس کا کوئی اقتدار نہیں خودمختاری خارجی آزادی رہی ہیں

مضمر ہے اور دیسی ریاستوں میں خارجی آزادی کی کوئی بھی صفت موجود نہیں۔ ان کے بیرونی معاملات کو جن سے ان کے باہمی تعلقات بھی شامل ہیں حکومت ہند اپنے ہدایات کے تحت انجام دیتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بین الاقوامی معاملات کے لئے وہ عملاً برطانیہ کے زیر دست ہیں اور اسی لئے دوسرے برطانوی مقبوضات کی طرح فوجی و سیاسی حفاظت کے مستحق ہیں دوسری طرف اپنے علاقوں پر قابض ہونے اور حکومت اعلیٰ کے اس قبضے کو تسلیم کرنے کی وجہ سے ان کو اندرون علاقہ کے انتظامات کے لئے کچھ حقوق حاصل ہیں یہ ملحوظ رکھنے کے بعد کہ برطانوی رعایا اور ریاستوں کے ان چھاؤنی کے شہروں پر جہاں برطانوی فوج مقیم ہو، والیان ریاست کو کوئی اختیار نہیں، اور نیز یہ ذہن نشین ہو جانے کے بعد کہ ہر ریاست کی فوج کی تعداد محدود ہے، ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ (۱) حکومت برطانیہ اور والی ریاست اُس علاقے کے اقتدار اعلیٰ کو تناسب کے اعتبار سے تقسیم کر لیتے ہیں یہ تناسب، مختلف ریاستوں کی تعریف و اہمیت، صلح ناموں اور باہمی مفاہمتوں یا کچھ سندوں یا رسموں کے مطابق ہوتا ہے۔ ان والیان ریاست میں سب سے زیادہ حقوق جن کو حاصل ہیں وہ اعلیحضرت حضور نظام حیدرآباد ہیں، جن کا اپنا سکہ رائج ہے، اپنی رعایا پر ٹیکس لگاتے ہیں، اور پھانسی کی سزا دیتے ہیں جس کا مرافعہ کسی برطانوی عدالت میں نہیں ہو سکتا؛ اقل ترین اختیارات کا نمونہ کاٹھیاواڑ کے چند ایکڑ والی ریاستوں کے حکمراں ہیں جو برطانوی محاصل سے آزاد ہونے کے ساتھ ہی برائے نام عدالتی حقوق بھی رکھتے ہیں"۔ [۱]

دیسی ریاستوں کی تعداد تقریباً ۷۰۰ ہے ان میں سے زائد از زائد ۶۰ یا ۷۰ ریاستیں ایسی ہیں جنھیں تھوڑی بہت اہمیت حاصل ہے باقی ان میں سے کوئی بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور بہت سی (خصوصاً صوبہ بمبئی کی ریاستیں تمام تعداد کی تقریباً نصف ہونگی) صرف معمولی رئیسوں اور جاگیرداروں کی ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں برطانوی حکومت نے میسور اور بڑاؤنکور کی قدیم ریاستوں کو بچایا اور انیسویں صدی کی ابتدا میں راجپوتانہ

---

[۱] البرٹ: حکومت ہند۔ صفحہ ۱۶۵۔

کی ریاستیں، جن میں سے اکثر قدیم ترین خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں برطانوی حمایت میں آگئیں۔ دوسری طرف حیدرآباد، کشمیر، گوالیار، بڑودہ، اور اندور کی سی بڑی اہم ریاستیں حال کی قائم شدہ ہیں، اور ہر والی ریاست کے آباؤ اجداد باہر سے اس علاقے میں آئے تھے، حیدرآباد کے فرمانروا جہاں کی ۹/۱۰ آبادی ہندو ہے مسلمان ہیں اور کشمیر کے حکمراں جہاں ۳/۴ آبادی اسلام کی پیرو ہے ہندو ہیں۔ ایسے اہم ترین قابل ذکر علاقے جو ابتداءً دیسی ریاستوں کی حیثیت سے تسلیم کر لئے گئے، لیکن بعد کو برطانوی علاقے کے ساتھ ان کا الحاق کر لیا گیا ناگپور اور لکھنؤ ہیں، ناگپور کو اصول بازگشت یعنی حکمراں کے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ۱۸۵۴ء میں ضبط کر لیا گیا اور اودھ کو انتہائی بدانتظامی کی بناء پر ۱۸۵۶ء میں ملحق کر دیا گیا۔ ذیل میں ہندوستان کی اہم دیسی ریاستوں میں سے بعض کے کچھ حالات درج کئے جاتے ہیں، یہ دس ریاستیں، تمام دیسی ریاستوں کے مربع کے ۲/۵ حصہ اور آبادی میں نصف سے زیادہ تعداد پر مشتمل ہیں،

	ریاست	آبادی (سنہ ۱۹۲۱ء)	حکمراں (خطاب، قوم و مذہب)
۱-	حیدرآباد	۱۲۴۵۴۰۰۰	ہز اگزالٹیڈ ہائینس نظام، ترکمان، مسلمان

(اورنگ زیب کے ماتحت دکن کے صوبہ دار آصفجاہ اول نے خود مختاری کا اعلان کر کے ۱۷۲۴ء میں موجودہ حکومت قائم کی، ٹیپو سلطان شاہ میسور کے لڑائیوں میں حضور نظام برطانیہ کے حلیف تھے اور برطانیہ نے ان کو مرہٹہ حکومت سے بچایا تھا)

	ریاست	آبادی (سنہ ۱۹۲۱ء)	حکمراں (خطاب، قوم و مذہب)
۲-	میسور	۵۹۷۸۰۰۰	مہاراجہ، ہندو

(میسور کے موجودہ حکمراں خاندان حکومت ودویاران کی تاریخ چودھویں یا پندرھویں صدی سے شروع ہوتی ہے ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شکست کے بعد یہ خاندان اس علاقے پر بھی جو ریاست میسور کہلاتا ہے دوبارہ حکمراں بنایا گیا، ۱۸۳۱ء میں بدانتظامی کی وجہ سے میسور برطانوی قبضے میں لے لیا گیا، ۱۸۸۱ء میں پھر قدیم حکمراں خاندان کو واپس کر دیا گیا)

	ریاست	آبادی (سنہ ۱۹۲۱ء)	حکمراں (خطاب، قوم و مذہب)
۳-	ٹراونکور	۴۰۰۶۰۰۰	مہاراجہ، ہندو

(یہاں کے مہاراجہ تین قدیم جنوبی تامل ریاستوں میں سے ایک ریاست چیرا کے حکمرانوں کے خاندان سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، تیسری جنگ میسور (۱۷۹۰ء)

دراصل اس ریاست کی وجہ سے ہوئی تھی اس لئے کہ اس کے اور انگریزوں کے درمیان مخالفہ ہوگیا تھا جس کی رو سے انگریزوں پر اس کی حفاظت فرض تھی)

۴۔	کشمیر و جموں	۳۳۲۲۰۰۰	مہاراجہ	راجپوت	ہندو

(۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر کو فتح کر کے پنجاب میں شامل کر لیا ۱۸۴۶ء میں پہلی جنگ سکھاں کے بعد یہ انگریزوں کو ملا اور انھوں نے اسے گلاب سنگھ کو دے دیا جسے ۱۸۲۰ء میں رنجیت سنگھ ہی نے جموں کا راجہ بنا دیا تھا اور جس نے دوران جنگ میں دوستانہ غیر جانب داری قائم رکھی تھی اور سکھوں پر جو تاوان جنگ لگایا گیا تھا، اس کے بیشتر حصے کے ادا کرنے کا ذمہ لیا تھا)

۵۔	بڑودہ	۲۱۲۲۰۰۰	گائیکواڑ	مرہٹہ	ہندو
۶۔	گوالیار	۳۱۰۶۰۰۰	مہاراجہ (سندھیا)	مرہٹہ	ہندو
۷۔	اندور	۱۱۴۸۰۰۰	مہاراجہ (ہولکر)	مرہٹہ	ہندو

(مندرجہ بالا ریاستیں وہ ہیں جو اٹھارھویں صدی کے آغاز میں مرہٹہ سرداروں نے قائم کر لی تھیں گائیکواڑ سے ۱۸۰۲ء میں صلح نامہ ہوا جس کی کبھی بھی خلاف ورزی نہیں ہوئی، سندھیا اور ہولکر سے آخری مفاہمت تیسری جنگ مرہٹہ (۱۸۱۷-۱۸۱۸ء) کے بعد ہوئی)

۸۔	اودے پور	۱۳۹۳۰۰۰	مہاراجہ	راجپوت	ہندو
۹۔	جے پور	۲۳۲۹۰۰۰	"	"	"

(مندرجہ بالا دو ریاستیں راجپوتانہ کی قدیم ترین ریاستیں ہیں جن کی تاریخ ساتویں اور بارھویں صدی عیسوی سے علی الترتیب شروع ہوتی ہے، ۱۸۱۸ء میں راجپوت ریاستوں کو دوستانہ صلحناموں کے ذریعے سے برطانوی حمایت میں لے لیا گیا)

۱۰۔	بھوپال	۶۹۱۰۰۰	بیگم	افغان	مسلمان

(ریاست بھوپال جو اسلامی ریاستوں میں حیدرآباد کے بعد اہمیت رکھتی ہے ۱۷۲۳ء میں اورنگ زیب کے ایک افغان افسر نواب دوست محمد خاں نے قائم کی ۱۸۱۷ء میں انگریزوں سے مستقل دوستانہ صلحنامہ ہوا ۱۸۴۴ء سے اس تخت پر خواتین ہی حکمراں رہیں، اور موجودہ بیگم صاحبہ ہندوستان کی واحد حکمراں خاتون ہیں)

ہندوستان کے اس لفظی سیاسی نقشے کو مکمل کرنے کے لئے، ان علاقوں کا جواب تک پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کے قبضوں میں ہیں تذکرہ لازمی ہے۔

پرتگالی صوبہ گوا کی تاریخ (جس کی آبادی تقریباً ۵ لاکھ ہے) سنہ ۱۵۱۰ء میں البوقرق کی تسخیر گوا سے شروع ہوتی ہے پونڈیچری کی اہم ترین فرانسیسی نو آبادی (جس کی آبادی ۲½ لاکھ سے زیادہ ہے) ابتداءً سنہ ۱۶۷۴ء میں قایم کی گئی تھی۔

(۳)

الغرض ہندوستان میں برطانوی صوبے اور دیسی ریاستیں دونوں دوش بدوش ہیں، اور امور متذکرۂ بالا یہ دکھانے کے لئے کافی ہیں کہ کس طرح یہ سیاسی تقسیم تاریخ کے بنائے ہوئے رستہ پر بنی ہے یا ہمیں انتظامی ضروریات کی بنا پر مختلف مواقع پر ترمیم ہوتی رہی، اب ہم کو ان بعض اصولی تقسیموں کی طرف جو سیاسیات ہند میں پورے طور سے داخل ہو گئی ہیں، متوجہ ہونا چاہئے اور یہ ۵ تقسیمیں ہیں جو قومیت، زبان، مذہب و ملت پر مبنی ہیں!

ہم زبان سے شروع کرتے ہیں کہ قومیت کے لئے یہ ایک بہت بڑا مشترک ہے، شمالی وسط ہند اور چند مستثنیات کے سوا مغربی دکن میں وہ زبانیں بولی جاتی ہیں جو ان دیسی زبانوں سے نکلی ہیں جو سنسکرت سے، جو قدیم ہند و آریائی زبان ہے، بہت مشابہ ہیں۔ یہ سنسکرتی زبانیں، تین مجموعوں میں منقسم نظر آتی ہیں یعنی بیرونی، اندرونی اور درمیانی مجموعہ کی زبان اردو ہندی ہے، جو وسط ہند میں بولی جاتی ہے، اور تقریباً تمام آبادی کا ایک ثلث اس کی مختلف بولیوں میں گفتگو کرتا ہے، شمال میں اردو ہندی سے قریب تر پنجابی ہے، یہ ہندوستان کی پانچ فی صدی آبادی کی زبان ہے[۱] اور مغرب میں راجستھانی (جو راجپوتانہ اور اس کے ملحقہ علاقوں کی زبان ہے) اور گجراتی (جو گجرات اور شہر بمبئی میں بولی جاتی ہے) یہ دونوں کم وبیش ایک دوسرے سے مدغم ہو جاتی ہیں اور ہندوستان کی ۸ فی صدی آبادی انہی میں بات چیت کرتی ہے۔ یہ تینوں زبانوں سے درمیانی مجموعہ بن جاتا ہے، بیرونی مجموعے میں جو زبانیں شامل ہیں وہ یہ ہیں، مرہٹی جس کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ مغربی دکن پر غالب، اور ۶ فی صدی آبادی کی زبان ہے، مشرق میں بنگالی (جسے ۱۵ فی صدی لوگ بولتے ہیں) اور اڑیسہ کی زبان اڑیا (جسے تین فی صدی لوگ بولتے ہیں) اور شمالی مغرب کی دو مشترک و مشابہ زبانیں سندھی اور لہندا (مغربی پنجابی) جس میں سے موخر الذکر پنجابی میں مدغم ہو جاتی ہے اور جو دونوں تقریباً ۳ فی صدی لوگوں کی زبانیں ہیں!

[۱] جو تناسب دیا گیا ہے وہ سنہ ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری سے ماخوذ ہے سنہ ۱۹۲۱ء کے مفصل اعداد ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکے ہیں [مترجم]

خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں یہ زبانیں آریہ تارکان وطن کی دو مختلف یکے بعد دیگرے آمدوں کے ساتھ آئیں جن کا زمانہ متعدد صدیوں پر حاوی ہے، اور جن میں سے بعد کے آنے والوں نے وسطی ہند اور گجرات پر قبضہ کرتے ہوئے ابتدائی مہاجروں کو ادھر ادھر منتشر کر دیا، خواہ یہ تاریخی توضیح صحیح ہو یا نہ ہو، یہ جغرافی حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اردو ہندی اپنی مختلف صورتوں اور اپنے سے بہت زیادہ مشابہ زبانوں یعنی پنجابی راجستھانی اور گجراتی کے ساتھ ساتھ، ایک بیرونی زبان کے حلقے میں جو سندھی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں پر مشتمل ہے اور جس سے اڑیا اور آسامی دونوں زبانیں متعلق ہیں، بہت واضح طور سے گھری ہوئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔

اب صرف ہند و یوروپی زبانوں کی تقسیم رہ گئی جنمیں تقریباً تمام آبادی کا $\frac{1}{3}$ حصہ بولتا ہے ان میں ایک یا دو سنسکرتی زبانیں ہیں جو ہمالیہ کے نشیبی علاقے کی پہاڑیوں میں بولی جاتی ہیں، ان میں ایک تو کشمیری ہے، جو ہند و آریہ زبان ہونے کے باوجود سنسکرت سے ماخوذ نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ اسی نوع کی دو آریہ زبانیں یعنی (بلوچی و پشتو) شمالی، اور مغربی سرحد میں بولی جاتی ہیں ۔

اگر معمولی طور سے ہم تمثیلاً بتانا چاہیں تو شاید ہم ہندوستان کی سنسکرت زبانوں کا یورپ کی نو لاطینی "یا رومانی" زبانوں سے موازنہ کر سکتے ہیں جو اگرچہ ایک ہی مشترک منبع سے نکلی ہیں، تاہم ہسپانوی اور رومانوی زبانوں کی طرح بعض ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور بعض نمایاں طور سے ہسپانوی اور پرتگالی کی طرح ایک دوسرے سے قریب تر ہیں، یہ حقیقت ملحوظ خاطر رکھنی چاہیئے کہ ہندی یا اس کی مفرس نوع اردو عہد مغلیہ سے ہندوستان کی عام زبان رہی ہے جس میں جنوبی ہند کا بھی ایک بڑا حصہ شامل تھا، البتہ یہ فطری ہے کہ جتنا جتنا ہم ہند و آریائی تمدن کے مرکز وسط ہند سے بڑھتے جائینگے، ہم کو نظر آئیگا کہ اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والے کم ہوتے جاتے ہیں، حروف تہجی و تحریر کا بھی یہی حال ہے، ہندوستان کے بیشتر حصے کے ہندو ناگری (سنسکرت) حروف استعمال کرتے ہیں، لیکن اردو فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے جنہیں عموماً مسلمان استعمال کرتے ہیں ناگری کا خط شکستہ کیتھی بہار سے گجرات تک تمام وسط ہند میں اور مہاجنی جیسے راجپوتانہ والے اور مارواڑی

مہاجن شمالی ہندوستان میں لکھتے ہیں، رائج ہے دوسرے مختلف خط جو بیشتر ناگری حروف سے ماخوذ ہیں گرمکھی پنجابی، بنگالی، اور اڑیا ہیں اس طرح زبان کے اختلافات کے ساتھ ہی ساتھ تحریر و طریقۂ طباعت کے بھی اختلافات موجود ہیں۔

جب ہم جنوبی ہند کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہاں دوسری ہی قسموں کی زبانوں کا مجموعہ ہے جو ہمارے سامنے ایک بالکل ہی مختلف تمدن پیش کرتا ہے شاید معیار زبان یورپ کی مغربی زبانوں سے اتنی مختلف نہیں ہے جتنی کہ جنوب کی دراوڑی زبانیں ہندوستان کی سنسکرتی زبانوں سے۔ انتہائی جنوب کی زبان (جس کا قدیم ترین نام دراوڑا ہے) تامل ہے اور اس سے قریب تر ساحل ملیبار اور ٹراونکور کی زبان ملیالم ہے ان دونوں زبانوں کے بولنے والے ہندوستان کی آبادی کے ۸ فی صدی اشخاص ہیں، تامل علاقے سے شمال میں جنوب کی جانب اسی حصہ زمین میں جو ریاست میسور کے بیشتر علاقے پر مشتمل ہوتا ہوا بمبئی کے اندر تک داخل ہو گیا ہے، کنڑی بولنے والے رہتے ہیں جن میں سے کثیر کرناٹک کہتے ہیں۔ زیادہ تر مشرق کی طرف اس علاقے میں جو مدراس کے وسطی و شمالی اضلاع سے ہوتا ہوا قلمرو سرکار آصفیہ کے اندر چلا جاتا ہے تلنگی بولنے والے آباد ہیں جو بعض اوقات ایک قدیم ہندو مملکت کی وجہ سے اندھرا بھی کہلاتے ہیں تلنگی جو تامل سے الفاظ و حروف تحریر دونوں اعتبار سے بالکل مختلف ہے ۱۲ فی صدی آبادی کی زبان ہے اور کنڑی جو اپنے الفاظ میں تو تامل ہے لیکن تحریر میں تلنگی سے مربوط ہے ۴ آبادی کی زبان ہے اس قسم کی کم اہم زبانوں مثلاً گونڈ اور کولو کو ملا کر دراوڑی زبانیں بولنے والے ہندوستان مجموعی آبادی کا ۲۰ فیصدی بن جاتے ہیں۔

اب صرف منڈا (جس کو ۱/۲ فی صدی آبادی جو بیشتر چھوٹا ناگپور کے اصلی باشندوں پر مشتمل ہے بولتی ہے) اور تبتی چینی زبانیں رہ گئیں جن کو ۴ فیصدی آبادی جو عموماً برہمی ہے استعمال کرتی ہے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ سیاسی نقطۂ خیال سے برہما ہندوستانی حکومت کا ایک جزو ہے لیکن جغرافی اور ہر دوسرے نقطۂ نظر سے اس کی

حیثیت جداگانہ ہے۔ یہاں کے باشندے ایک علیحدہ قومیت یعنی ہند و چینی اور ایک علیحدہ مذہب یعنی بودھ مت اور بالکل ہی مختلف تمدن کے مالک ہیں آج خاص ہندوستان میں عملاً ایک بھی بدھ مذہب کا پابند موجود نہیں ہے، اور اس طرف برہمنوں (ذات) جو ہندو مذہب کی ممتاز خصوصیت ہے بالکل مفقود ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں لسانی تقسیم اور قومی تقسیم کم و بیش دوش بدوش چلتے ہیں، لیکن گو اس سے کسی طرح بھی یہ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ تمام لوگ جو ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایک ہی قوم سے بھی تعلق رکھتے ہوں تاہم ہندوستانی آبادی کی لسانی تقسیم اس کی قومی و مذہبی تقسیم سے بہت زیادہ مماثل و مشابہ ہے۔

اس مسطح اور مرتفع علاقے میں جو جزیرہ نمائے ہند کہلاتا ہے اور جو پہاڑوں کی غیر مسلسل چوڑی دیواروں اور جنگلوں سے گھرا ہوا ہے جو وسط ہند میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں کوہ قاف کی ایک قدیم سیاہ فام شاخ جسے داراوڑی کہتے ہیں ایک نہایت ہی بعید زمانے سے علیحدہ رہتی سہتی چلی آتی ہے، سلسلۂ ہندھیاچل کے شمال میں ایک ہند و آریائی قوم نے وہاں کی آبادی پر اپنے خصایص اپنی زبانوں اور اپنے تمدن کا سکہ بٹھایا ہے[1]، ہمارے یہ تسلیم کرنے کے بعد بھی کہ (۱) آبادی کا ایک بڑا حصہ جو جسمانی ساخت میں بہت کچھ دراوڑی خصایص رکھتا ہے، ہند و آریائی زبانیں بولتا ہے (۲) دوسرے یہ کہ ابتدائے عہد تاریخی ہی میں دراوڑی تمدن نے ہند و آریائی تمدن سے متاثر ہو کر بالکل ہندو جامہ پہن لیا تھا اور (۳) ہندو مذہب میں بہت سی ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جو حقیقۃً دراوڑی ہیں، یہ دو نمایاں حقیقتیں اپنی جگہ پر باقی رہتی ہیں۔

[1] یہ ایک وسیع تعمیم ہے ہم کو چھوٹا ناگپور کے منڈا بولنے والے اصلی باشندوں کو نظر انداز نہ کرنا چاہئیے جو اگرچہ لسانًا دراوڑیوں سے بہت مختلف ہیں لیکن جسمانی ساخت کے لحاظ سے ان سے بہت مشابہ ہیں اور نہ اس اثر کو فراموش کرنا چاہئیے، جو شمالی ہند کے تاریخی عہد کی شمال و مغرب کی طرف سے آنے والی لاتعداد جماعتوں کی جسمانی ساخت میں نمایاں طور پر سے ظاہر ہے جن میں وہ قومیں بھی شریک ہیں جن کے ذریعے سے مذہب اسلام ہندوستان میں پھیلا،

آؤ ان دونوں حقیقتوں کو پیش نظر رکھکر ہم ہندوستان کے نقشے پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں شمال بعید میں ہم کو کشمیری نظر آتے ہیں یہ مضبوط آریائی قوم کے لوگ ہیں، جن کی زبان، ادبیات اور تمدن سے بالکل الگ ہے اس کے بعد ہم پنجاب (جہاں کی نمایاں نسل ہندو آریائی ہے) اور راجپوتانہ (جہاں کی اصلی راجپوت اقلیت ملک پر حکمراں ہے) پہونچتے ہیں؛ شمال مغرب میں سندھ واقع ہے جو خود اپنی مستقل تاریخ و زبان کا مالک ہے اور جس میں کشمیر کی طرح مسلمانوں کی اکثریت ہے پنجاب کے جنوب میں وہ وسیع وسطی علاقہ ہے جو اس آبادی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے جس میں آریہ، دراوڑی اور دوسرے اصلی باشندوں سے بہت کچھ مخلوط ہو گئے ہیں، اور جہاں اردو ہندی اور اس کی مختلف بولیاں رائج ہیں بہار (قدیم مگدھ) اور اودھ (قدیم اجودھیا) اپنے قومی اور تاریخی خصایص کے مالک ہیں۔ اب بنگال پہونچکر ہم ایک ایسی آبادی سے دوچار ہوتے ہیں جیسے تم جو چاہو کہو، لیکن وہ کسی دوسری آبادی سے کبھی مشابہ نہیں ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دراوڑی قوم ہے جس کی ایک خارجی یعنی (ہند چینی) عنصر کے ذریعے سے گویا ترمیم کی گئی ہے۔ لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے لئے یہ کہد ینا کافی ہے کہ بنگالی ہندوستان کی مسلمہ بہترین قوموں میں سے ہے۔ بالکل اسی طرح اپنی نسلی خصائص میں ممتاز اور قومی روایات میں مختلف مغربی ہند کی مرہٹہ قوم ہے اس قوم کے متعلق بھی یہ خیال ہے کہ یہ بھی دراوڑی جس میں خارجی عناصر مل گئے ہیں یہ عنصر ایک نظریے کے لحاظ سے اسکیتی یعنی مغولی اور دوسرے نظریے کے لحاظ سے الپائن ہے ایک اور مغربی قوم جو اپنی ادبیات اور تاریخ کے لئے ممتاز و مشہور ہے گجراتی ہے خاتمہ پر جنوب، اور جنوب مشرق میں خالص دراوڑیوں میں ایک طرف تو کنٹری اور تامل ہیں جن کی اپنی مستقل خصائص ادبیات اور تاریخ ہے اور دوسری اندھرا (یعنی تلنگی بولنے والے) اور اڑیہ ہیں جو کچھ زمانے سے حکومت ہند پر یہ دباؤ ڈال رہے ہیں کہ ان کو مستقل قومی جماعتیں تسلیم کر لیا جائے اور اس بات کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ موجودہ سیاسی حدود کی اس طرح نظر ثانی کی جائے کہ ان میں سے ہر ایک کو تحتانی صوبے کی قسم کا ایک علیحدہ نظام مل جائے جو قومی خصایص پر مبنی ہو۔

بس ایک نقطۂ نگاہ سے تو ہندوستان ایک ایسا ملک ایک چھوٹا براعظم ہے، جو زبانوں، روایتوں، اور نسلوں کے اعتبار سے متعدد نمایاں قوموں پر منقسم ہے دوسرے نقطۂ خیال سے کوئی چیز بھی اتنی آسانی سے نہیں دکھائی جا سکتی جتنا کہ ہندوستان کی لازمی وحدت کا مسئلہ ہے، اس سے ایک مشترک قومیت مراد نہیں ہے بلکہ وہ مشترک تمدن ہے جو مشترک روحانی خاندان کا گویا جانشین ہے کہ زمانہ ہوا ہندو مذہب نے ہندوستان کو متحد اور ناقابل انتشار طریقے پر متحد کر دیا، اور یہ وہ وحدت ہے جو قومی اور نسلی حدود کو نظر انداز کر دیتی ہے ' ذات کا اصول' برہمنوں کی عزت جو بلند ترین اور مذہبی ذات ہے، گائے کی حرمت ہندو رسمیہ تعظیمیں ہندوستان کے سات دریاؤں کا تقدس، ہندوستان کے سات مقدس شہروں کی جاترا یہ تمام چیزیں گویا اس ملک کا عام و مشترک ورثہ ہیں؛

اس جگہ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کے لوگ — زبان اور نسل کی طرح مذہب کے لحاظ سے منقسم ہیں بادی النظر میں چاہئے، اکثر مسلمانوں نے ہندو معاشرت اختیار کر لی ہو، اور بعض اوقات دونوں فرقوں کے رہنماؤں نے کتنا بھی اظہار یگانگت کیوں نہ ہو جائے خیالات و جذبات کا ایک اصولی اختلاف موجود رہتا ہے، جس کا آئرستان میں السٹر کے پروٹسٹنٹ اور ان کے ہموطن کیتھولک گروہ کے باہمی اختلاف سے موازنہ کیا جا سکتا ہے، سندھ اور کشمیر میں مسلم اکثریت ہے، اور یہی حال بلوچستان اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ کا ہے، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی تعداد نصف ہے دوسرے صوبوں میں اگرچہ تعداد کے لحاظ سے وہ کم ہیں، تاہم تمام شمالی ہند میں تاریخی اسباب کی بنا پر بڑے بڑے شہروں میں ان کی خاص اہمیت ہے ان مسلمانوں کی مجموعی تعداد ملک کی آبادی کا ⅕ حصہ ہے۔

ملک کے اور مذاہب میں جو ہند کی سیاسی زندگی پر بڑا اثر رکھتے ہیں ایک مذہب سکھوں کا ہے جن کی تعداد پنجاب کی آبادی میں بارہ فی صدی ہے سکھ ایک ایسے مذہبی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو نیم فوجی ہے۔ مذہب میں وہ ایک خدا کے قائل ہیں اور ذاتوں کی تفریق کو نہیں مانتے ہیں۔ قریب کے گزشتہ سالوں میں انھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت میں بھی خاص کر طبقۂ ادنیٰ

کے لوگوں میں کوشش کی۔ پارسی جو دراصل ایران سے آئے ہیں آٹھویں صدی عیسوی سے مغربی ہند (گجرات) میں آباد چلے آتے ہیں۔ ان کی تعداد کم ہے لیکن وہ بہت ترقی یافتہ اور صاحب قوت جماعت ہیں۔ یہ زردشتی مذہب کے پیرو ہیں اور ان کی تعداد ایک لاکھ نفوس ہے۔ ہند میں حالیہ صنعت و تجارت کے جو بڑے کام ہو رہے ہیں ان میں یہ بہت ممتاز ہیں۔ رہے عیسائی تو ان کی تعداد تقریباً چالیس لاکھ یا آبادی کے سواتی صدی کے برابر ہے[1] ان میں تقریباً ۲۰۰۰۰۰ (جس میں تقریباً ۷۰۰۰۰ انگریزی فوج بھی شامل ہے) یوروپین ہیں ایک لاکھ مخلوط النسل ہیں اور باقی دیسی عیسائی ہیں، اینگلو انڈین (یوروپین) فرقے علانیہ اپنے سیاسی عقاید میں یوروپین ہیں، لیکن ہندوستانی عیسائی عموماً اپنے خیالات و نقطۂ نگاہ میں قوم پرست ہیں۔

جب ہم معاشری تقسیم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم کو نظر آتا ہے کہ ہندو معاشرت کا بنیادی اصول ذات پات ہے، اور یہ اصول تمام ہندوستان پر حاوی ہے ذاتوں اور ان کی شاخوں کی تعداد غیر محدود ہے، ان میں سے بعض تو محض مقامی ہیں اور بعض قومی اہمیت رکھتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف برہمنوں میں دو ہزار سے زیادہ ذاتیں ہیں ذات کو ایک طرف تو فرمینسری اور دوسری جانب اتحاد مزدوراں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، لیکن اس کی ممتاز صدیوں سے آج تک خصوصیت چلی آتی ہے کہ کوئی شخص بھی ایک ایسی ذات میں داخل نہیں ہو سکتا جس میں وہ پیدا نہیں ہوا ہے، اور نہ اپنی ذات یا پنچی ذات کے باہر شادی ہی کر سکتا ہے اگر ہم اس مشترک کیفیت کو جو باہمی شادی کی وجہ سے مختلف قومی و معاشری خصائص سے ملکر ایک آبادی میں پیدا ہو جاتی ہے "سنار کی کٹوری" سے تشبیہ دیں تو اسی طرح شاید ہم ذات پات کے نظام کو متعدد عناصر کے بلوروں سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کا ہر جز و ترکیبی قلماؤ کے بعد ایک مختلف شکل اختیار کر لیتا ہے، مدت دراز سے اس قسم کے قلماؤ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف اس نے مستحکم ترین و دیرپا قسم کا معاشری اتصال

---

[1] رپورٹ مردم شماری سنہ ۱۹۱۱ء۔

پیدا کر دیا ہے جو ہندو معاشرے کی بہترین شئے ہے اور جو ہر ذات کے مختلف اجزا کو ایک ہی رشتے میں مضبوطی سے منسلک کر دیتا ہے، وہاں دوسری طرف اس نے قومی و نسلی اتصال کو بالکل ہی ناممکن بنا دیا ہے، اس عجیب معاشری ہیولے کے متعلق یہ کہنا کہ یہ جمہوری اوارات کی راہ میں کس حد تک رکاوٹ ڈالیگا یا ان میں ترمیم کرے گا بہت مشکل ہے، صرف تجربہ ہی سے معلوم ہو سکتا ہے ملک کے صرف اُن حصوں میں جہاں خاص فرقوں کو اہمیت حاصل ہوتی ہے، ذات کا مسئلہ فوری سیاسی مشکلات پیدا کرتا ہے، مثلاً صوبۂ مدراس میں برہمنوں کی اقلیت کو بہت کچھ معاشری وقار حاصل ہے اور اس فرقے کے ضرورت سے زیادہ سیاسی غلبے سے نہ صرف اچھوتوں کو بلکہ اوسط درجہ کے ہندو طبقوں کو جو غیر برہمن ہیں بچانا ضروری سمجھا گیا، یہی صورت حال ایک دوسری جگہ یعنی مرہٹوں کے ملک میں بھی موجود ہے لیکن عام طور پر ذات پات سے ایک طبقے اور دوسرے طبقے کے مابین اسقدر شدت کے ساتھ تضاد نہیں پایا جاتا۔

بلاشبہ معاشی حیثیت سے البتہ ذات پات انفرادی جارت طرازی کو روکتی اور مزدوروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے سے باز رکھتی ہے تاہم اس وقت تک کہ سیاسی دستور کے ارتقا کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں صنعتی انقلاب بھی نہ ہو جائے اور اس میں کافی وسعت و ترقی نہ ہولے اس بارے میں حکم لگانا سخت غلطی ہوگی۔

یہاں اس بات کو پورے زور کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آج بھی ہندوستان وہی ہندوستان ہے جو صدیوں سے چلا آتا ہے یعنی وہ کسانوں کا ملک ہے۔ جس میں ہر شخص کے حصے میں تقریباً تین ایکڑ زمین پڑتی ہے، تمام آبادی کا ۳/۴ حصہ ایسے دیہاتوں میں رہتا ہے جن کی آبادی ... ۵ نفوس سے کم ہوتی ہے اور ۱/۱۰ ایسے قصبوں میں رہتا ہے جن کی آبادی پانچ ہزار سے کم ہے رنگون کو مستثنیٰ کر کے اور ہوڑہ کو کلکتے ہی کا ایک جز تسلیم کر لینے کے بعد تمام ہندوستان میں صرف پندرہ ایسے شہر ہیں جن کی آبادی ڈیڑھ لاکھ یا اس سے زیادہ ہے[1]

---

[1] رپورٹ مردم شماری سنہ ۱۹۲۱ء۔

اور ان میں سے بھی صرف پانچ یعنی کلکتہ، بمبئی، مدراس، احمد آباد اور کانپور موجودہ اصطلاح میں بڑے صنعتی مرکز ہیں جیسا ہم دیکھ چکے ہیں، ہر ہزار نفوس میں، نوسو دیہاتی، ان میں زراعتی طبقوں کے علاوہ جن میں زمیندار، کاشتکار، اور مزدوروں کی بڑی تعداد شامل ہے، تھوڑی آمدنی والے مالگذار، دیہاتی بنیئے، مہاجن اور مخصوص دیہاتی پیشہ ور، و ملازم مثلاً چوکیدار (پولیس والا) لوہار، بڑھئی، اور حجام بھی شامل ہیں۔ تمام آبادی کے ہر ہزار نفوس میں سو تو شہروں کے باشندے ہوتے ہیں اور ان میں سے صرف (۵) تعلیم یافتہ انکم ٹیکس دینے والے متوسط طبقے کے لوگ ہوتے ہیں، جو تجارت اور پیشوں میں مشغول ہیں، ۱۵ موجودہ صنعتی کلوں میں جن میں ریل اور کوئلے کی کانیں بھی شامل ہیں ملازم ہیں اور باقی ۸۰ دیسی صنعتوں اور اور مختلف کاموں میں مشغول ہیں۔[۱]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کے سے ملک میں جس نے صنعتی حیثیت سے کوئی بھی ترقی نہ کی ہو جہاں وہ طبقہ جو تعلیم کے ساتھ کچھ فرصت بھی رکھتا ہو، اس قدر کم ہو انظام جمہوری کے تحت جو حال میں رائج کیا گیا ہے، رہنمائی کا کام صرف دو جماعتوں کے کاندھوں پر رہجائیگا یعنی قانون پیشہ اصحاب جو متوسط درجے کی شہری آبادی کے گویا ستون ہیں اور بڑے بڑے روسا، و زمیندار یہ یاد رکھنا مفید ہوگا کہ ابھی بہت عرصے تک ہندوستان کے عام نمائندے اور قانون ساز انھیں دو جماعتوں سے لئے جایا کریں گے۔

---

[۱] منقول از متفقہ (مانٹیگو چیمسفورڈ) رپورٹ پارہ ۳۳۲ میرے دئیے ہوئے اعداد اور پارۂ مذکورہ کے اعداد میں ظاہراً جو اختلاف ہے اور اس کی توضیح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جب متفقہ رپورٹ میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہر ہزار میں پندرہ پیشہ ور ہیں اور پندرہ سرکاری ملکی یا فوجی ملازمت میں تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان اعداد میں شہری اور دیہاتی دونوں شریک ہیں، اور نیز میں نے جو اعداد دئیے ہیں وہ بھی صرف انکم ٹیکس دینے والی آبادی پر منطبق ہوتے ہیں۔

(۴)

۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو وزیر ہند مسٹر ای، ایس مانٹیگو نے دارالعوام میں مندرجۂ ذیل اعلان کیا: ۔

"حضور ملک معظم کی حکومت کی حکمت عملی جس کے ساتھ حکومت ہند کو بھی کامل اتفاق ہے یہ ہے کہ ملکی انتظامات کے ہر محکمہ میں ہندوستانیوں کی شرکت بڑھائی جائے اور سوراجی ادارات میں تدریجی ارتقا کی کیفیت پیدا کی جائے تاکہ ہندوستان کو سلطنت برطانیہ کے ایک لازمی جز کی حیثیت سے ذمہ دارانہ حکومت بتدریج مل جائے ...."

"میں اس میں صرف اس قدر اضافہ کروں گا کہ اس حکمت عملی میں مختلف مدارج ہی کے ذریعہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے برطانوی حکومت اور حکومت ہند ہی پر جن پر ہندوستانیوں کی بہبودی و ترقی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہر تدریجی ترقی کے وقت کیفیت کا انحصار ہوگا اور اس کا معیار وہ ان اشخاص کا اشتراک عمل اور ان کی حس ذمہ داری ہو گی جن پر اس جدید ترقی کا دارومدار ہوگا۔"

برطانوی سیاسیات کی یہ خصوصیت ہے کہ جس طرح آج تک یہ بتانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی بنیاد کیا ہے اس طرح اس کے متعلق بھی کوئی ذمہ دارانہ بیان نہیں دیا گیا ہے، کہ ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کی غایت کیا ہے یہ بھی ایک قابل توجہ حقیقت ہے کہ مسٹر مانٹیگو کا اعلان جو انتہائی احتیاط اور مہینوں کے بحث و تمحیص کا نتیجہ تھا، ظاہرا دارالعوام کے ایک عام رکن کے سرسری سوال کے جواب میں سرسری طور پر بیان کر دیا گیا تھا۔

حکمت عملی کا یہ اعلان برطانوی ہند کی تاریخ میں ایک عہد جدید کا آغاز کرتا ہے، جب لارڈ مارلے نے جو ایک بڑے لبرل مدبر اور وزیر ہند کے سب سے ذی اثر شخص تھے ۱۹۰۸ء میں اپنی مشہور اصلاحات کو پیش کیا تو حتی الامکان نہایت ہی پرزور طریقہ سے اس بات کی تردید کی کہ ان کا ذرا بھی اس بات کا ارادہ نہیں ہے کہ وہ ہندوستان میں پارلیمنٹی طریقہ کی حکومت کا ابتدائی

نظام بھی جاری کریں۔ جب لارڈ ہارڈنگ نے اپنے والسرائے ہند ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ۱۹۱۱ء میں وزیر ہند کو لکھا کہ ان کی رائے میں ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کی واحد غایت یہ ہو سکتی ہے کہ :-

"تدریجاً تمام صوبوں کو حکومت خود اختیاری کے تمام حقوق دیدئے جائیں تاآنکہ ہندوستان خود مختار صوبوں کا مجموعہ بنجائے جو سب کے سب حکومت ہند کے ماتحت ہوں"

اور جب یہ بتایا گیا کہ صوبہ واری حکومت خود اختیاری کی پیشین گوئی کرنے میں وہ اس کے سوا راج کی پیشین گوئی کرتے ہیں، تو حکاموں کے مسلسل انکار کا ایک راگ چھڑ گیا۔ لیکن پھر بھی ۱۹۱۷ء میں پارلیمنٹ اس بات کو جس کے متعلق چند برس پیشتر برطانوی کہتے تھے کہ اگرچہ صحیح تدبر کے منافی نہ ہو لیکن عملی سیاسیات کی سرحد سے ضرور خارج ہے ۱۹۱۷ء میں اپنی مسلمہ حکمت عملی قرار دیتی ہے۔

یہ نہ فرض کر لینا چاہئے کہ ابتدائی عہد ہی سے عقیل اور دور اندیش اشخاص نے برطانوی حکومت کے ماتحت ہندوستان کی سیاسی قسمت کے مسئلہ پر توجہ نہیں کی ہے۔ اس مسئلہ کی طرف نہایت جراوت سے توجہ کرنے والوں میں مدراس کا گورنر (۱۸۲۰ء) اور اینگلو انڈین تاریخ کی اہم شخصیت سر تھامس منرو تھا جس نے اپنا خیال حسب ذیل ظاہر کیا۔[۱]

"ہم کو اپنے تمام انتظامات میں اس ایک بڑے سوال کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہاں کے لوگوں کے اخلاق پر اس کا آخری نتیجہ کیا ہوگا ان کا معیار اخلاق بلند کیا جائیگا یا پست؟ کیا ہم صرف اس بات پر قانع ہو کے بیٹھ جائینگے کہ حکومت ہمارے ہاتھ آجائے اور لوگوں کی ہم حفاظت کریں خواہ وہ اخلاقاً موجودہ حالت سے بھی بدتر ہو جائیں؟ یا اس بات کی کوشش کریں گے

[۱] منرو نے ایک سرکاری مراسلت میں لکھا تھا کہ "ہم ایک زمانے میں ہندوستانیوں کو اس قابل بنادیں گے کہ وہ اپنے اوپر خود حکومت اور اپنی آپ حفاظت کر سکینگے" (منقولہ سر ولن ٹائن چرول ان انڈیا اولڈاینڈ نیو صفحہ ۷۷)

کہ ان کے معیار کو بلند کر سکے ان کو اس قابل بنائیں کہ وہ اپنے ملک کے انتظام میں اعلیٰ عہدوں پر کام اور ملک کی بہبودی کے لئے ترقی کی راہیں تلاش کر سکیں؟"

اگر سچ پوچھا جائے تو ۱۸۱۳ء کے قانون منشور[1] کے وقت ہی سے پارلیمنٹ نے اس بات کا سامان مہیا کر دیا کہ یہاں کے باشندوں کا معیار اخلاق بلند کر کے ان کو ملک کے اعلیٰ عہدوں کے لایق بنایا جائے اور ہندوستان کی مالگذاری میں سے ایک لاکھ روپیہ کی منظوری اس لئے دی کہ۔

"اس رقم کو علیحدہ رکھ کر ادبیات کے احیاء و ترویج، تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ہمت افزائی اور برطانوی ہند کے باشندوں میں علوم کی اشاعت میں صرف کی جائے۔"

اور ۱۸۳۳ء کے قانون منشور میں مندرجۂ ذیل مشہور دفعہ تھی کہ:۔

"مذکورۂ بالا علاقوں کا کوئی باشندہ بھی اپنے مذہب، مولد، رنگ یا ان میں سے کسی ایک کی وجہ سے بھی کمپنی کی کسی جگہ ملازمت یا نوکری کے ناقابل نہیں سمجھا جائیگا۔"

اس کے بعد کی ممتاز منازل ہندوستان کی تعلیم پر ۱۸۳۵ء میں میکالے کی رپورٹ جو اس وقت حکومت ہند کا قانونی رکن تھا، اور ۱۸۵۴ء میں صدر مجلس نگران سر چارلس وڈ کا تعلیمی مراسلہ ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا نظام تعلیم قائم کیا گیا، جس کے ذریعہ متوسط طبقے میں انگریزی زبان میں مغربی طرز پر تعلیم رائج کرنے کے لئے ایک ہائی اسکول اور ایک کالج اور جاہل عوام میں ملک کے ذرائع کے مطابق دیسی زبانوں میں ابتدائی تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاج برطانیہ کے قبضے میں زمام حکومت دیدینے

---

[1] وہ قوانین جن کے ماتحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے منشوروں کی تجدید ہوتی اور جن کے ذریعہ کسی کی عرصہ کی بقا کے لئے جو شرائط عائد کی جاتیں اُن پر نظر ثانی کی جاتی یہ ہ ۱۷۹۳ء، ۱۸۱۳ء، ۱۸۳۳ء اور ۱۸۵۳ء میں منظور ہوئے تھے۔

اور پارلیمنٹ کے بلاواسطہ اور بلاشرکت غیرے حکومت ہند کی ذمہ داریاں قبول کر لینے کے تین سال بعد ۱۸۶۱ء میں اس مجلس میں جو گورنر جنرل سے متعلق تھی اور جس میں برطانوی ہند کے لئے قانون وضع کئے جاتے تھے نصف درجن غیر سرکاری ارکان کو جن میں ملکی باشندے بھی شامل تھے داخل کر کے سب سے پہلے برطانوی ہند کے آئین میں اصول نمائندگی کی باقاعدہ عملی تصدیق کی گئی اور اسی قسم کی شرکت کا قاعدہ ان صوبہ داری مجالس میں بھی مقرر کیا گیا جو مدراس اور بمبئی کے گورنروں اور بنگال کے لفٹنٹ گورنر کے ماتحت تھیں انھیں مجالس مقننہ کا ارتقاء گویا برطانوی ہند کی نیابتی ادارات کی تاریخ کا مترادف ہے، جس طرح، ۱۷۹۳ء، ۱۸۱۳ء، ۱۸۳۳ء، اور ۱۸۵۳ء کے تدریجی قوانین منشور سے اس نظام حکومت کے جس کو برطانوی حکمرانوں نے قائم کیا تھا، قیام و استحکام کی منازل کا پتا چلتا ہے، ٹھیک اسی طرح ۱۸۶۱ء و ۱۸۹۲ء اور ۱۹۰۹ء کے قوانین مجالس ہند اور سب سے آخر میں ۱۹۱۹ء کا قانون حکومت ہند اس سے زیادہ واضح طریقہ سے ہندوستان کی تدریجی سیاسی و قومی ترقی کو بتاتے ہیں۔ اس طریقے کا حال جس کے ذریعہ غیر سرکاری نمائندہ عنصر تدریجی طریقہ سے بڑھایا اور روز افزوں بنیاد عمومی پر قائم کیا گیا اور کس طرح قانون سازی کے ساتھ ملکی انتظامات بھی رفتہ رفتہ شامل ہونے لگے باب (۲) میں ملے گا۔

ایک نمایاں قدم جسے ہم کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے موجودہ طرز کی مقامی حکومت خود اختیاری کا نظام تھا جسے ہر دل عزیز لبرل وائسرائے لارڈ رپن (۱۸۸۰ء) نے رائج کیا تمام صوبوں میں تقریباً برطانوی نمونہ پر ہر جگہ شہری و دیہاتی مقامی ادارات قائم کئے گئے جنھیں مقامی سڑکوں، ابتدائی مدرسوں، عام شفاخانو اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کے لئے اختیارات اور روپئے دے گئے اس موضوع پر ایک مشہور تجویز میں جسے لارڈ رپن کی حکومت نے ۱۸۸۲ء میں شایع کیا تھا، اس نئی حکمت علمی کی حمایت کی گئی تھی، اس لیئے نہیں کہ اس طرح یہ امور اس وقت سے جبکہ حکومت کے تحت میں یہ کام تھے بہتر طریقہ سے انجام پائینگے (ابتداء میں تو اس قسم کی کوئی توقع قائم ہی نہیں کی جاسکتی) بلکہ

جیسا کہ نہایت صراحت سے ابتدا ہی میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس لئے کہ یہ عام سیاسی تعلیم کا ذریعہ ہوگی اس موخر الذکر نقطۂ نگاہ سے بھی اس تجربہ کے حقیقی نتائج نہایت ہی مایوس کن پیدا ہوئے ایک طرف تو ان مقامی سیاسیات نے توقع کے مطابق مقامی توجہ اور عام ہمدردی حاصل نہیں کی اور دوسری جانب مجالس بلدیہ اور مجالس اضلاع کو اس طرح سختی سے جکڑ بند کر دیا گیا کہ ان کے لئے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ناممکن ہو گیا۔ بہرکیف ان مقامی مجالس کی بنیاد سے جو عام اور ایک بڑی حد تک انتخابی اصول پر تھی اصول نمائندگی پر گویا مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔ اگر مقامی معاملات کا انتظام مقامی آبادی کے نمائندوں کے حوالہ کیا جا سکتا تھا تو کیا یہ مطالبہ کہ صوبوں کے انتظامات میں صوبوں کے نمائندوں کو کچھ حصہ دیا جائے غیر واجب تھا؟ اگر ہندوستانیوں کے لئے خود اپنے پر حکومت کرنا سیکھنا اچھی بات تھی خواہ اس میں ان سے غلطیاں ہی سرزد کیوں نہ ہوں، تو پھر ان کو مقامی خود مختاری تک کیوں محدود کر دیا جائے؟ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حکومت کے وسیع تر حلقہ عمل میں مشکلات زیادہ سخت اور ذمہ داریاں زیادہ نازک ہوتی ہیں تو بھی اس سے یہ اقرار پایا جاتا ہے کہ اس وسیع حلقہ کے لئے ذرا زیادہ صلاحیت درکار ہے، اور اگر سیاسی تعلیم ایک قسم کی صلاحیت پیدا کر سکتی ہے، تو وہ دوسری قسم کی صلاحیت کیوں نہیں پیدا کر سکتی؟ الغرض اصول نمائندگی کی اس تصدیق نے ایک نظیر قائم کر دی اور جب ۱۸۹۲ء میں مجالس مقننہ کی دوبارہ ترتیب کا مسئلہ پیش ہوا تو یہ اصول نظر انداز نہ کیا جا سکا۔

۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۰ء تک ہندوستان کی فضا سیاسی اصلاحات کی ہوا سے بھری تھی۔ ۱۸۵۴ء کی مراسلت میں سر چارلس وڈ کی اعلان کردہ حکمت عملی، ۱۸۵۷ء میں کلکتہ بمبئی اور مدراس کے جامعوں کا قیام اور ۱۸۶۱ء میں غیر سرکاری ہندوستانی عنصر کی مجالس مقننہ میں شمولیت اپنا نتیجہ دکھانے لگی۔ ہندوستانی متوسط طبقہ میں ایک ایسی نسل جس نے مغربی تعلیم پائی تھی پیدا ہو چکی تھی اس طبقے کی تعلیم اخبارات کے اجرا میں بہت معاون ثابت

رہو ئی اور اس نے ذہنی انقلاب پیدا کیا، برک و برائٹ کی خطابت کے پروردہ، مزینی کے حب وطن کے متوالے، تاثر پذیر دماغوں نے ہندوستان کے شاندار مستقبل کا خواب دیکھنا شروع کیا اس وقت ان کا صحیفہ سیاسی گویا وسطی عہد وکٹوریا کا عقیدہ پر در لبرل اصول تھا ابتداً اگرچہ خیالات قبل از وقت وخام تھے مگر بہت جلد انھوں نے مستقل صورت اختیار کر لی ۱۸۸۵ء میں مسٹر اے، او، ہیوم کی رہنمائی میں جو سابق میں ایک سرکاری عہدہ دار رہ چکے تھے کانگریس قائم ہوئی، اور اس جدید سیاسی مسلک کے پیرووں کا مرکز بن گئی اپنے قیام کے زمانے ہی سے انڈین نیشنل کانگریس اپنے صوبہ داری وضلعواری شاخوں جلسوں اور سالانہ مرکزی اجلاسوں جن میں قرار دادوں کی بھرمار ہوتی، اپنی برطانوی کمیٹی اور اپنے ہفتہ وار اخبار انڈیا کے ذریعہ حکومت برطانیہ کے ماتحت ہندوستان کی کامل خود مختاری کے لئے منظم و مسلسل تبلیغ واشاعت کرتی رہی اس کا طریقہ کار آئینی جدوجہد تھا، جس کے ذریعہ ایک طرف تو ہندوستان میں دفتری اقتدار کم کرنے کی اور دوسری طرف انگلستان میں اصلاحات کے موافق فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی،

یہ ہلکا سا سرسری بیان وتاریخی سواد ہے جس کے سامنے ہندوستان میں مسٹر مونٹیگیو کی زبان سے برطانوی حکمت عملی کا اعلان نظر آتا ہے، چونکہ بیان سرسری ہے اس لئے اس سے تصویر کا پس منظر کافی واضح نظر نہیں آتا ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لارڈ ہارڈنگ کے ۱۹۱۱ء کے زاید از ضرورت صریح انداز سے مسئلہ خود مختاری کے اعلان پر سرکاری حلقہ کا انکار اور ۱۹۱۷ء میں مسٹر مانٹیگو کی اسی اعلان کی غیر مشروط تصدیق دو مختلف عہدوں کی دو مختلف چیزیں ہیں اس ظاہری تضاد کی توضیح یہ ہے کہ ہم نے جو سرسری خاکہ کھینچا ہے اس میں گزشتہ جنگ اور اس میں ہندوستانیوں نے جو حصہ لیا اس کا نقشہ مکمل طور سے نہیں کھینچا ہے افراد کا حافظہ خراب ہو لیکن قومی حافظہ دیرپا ہوتا ہے اور جہاں ہندوستان اس کو ہمیشہ یاد رکھے گا وہاں انگلستان بھی کبھی نہ بھولے گا کہ کس طرح ہندوستان نے برطانوی حکومت کے دوسرے حصوں کی طرح مشترک خطرہ کے وقت واضح

وصاف آواز میں لیتبک کہا یہ ہندوستان نے جو کچھ جنگ کے ابتدائی ایام میں کیا بجنسہ وہی ۱۹۱۸ء کے نازک ترزمانے میں بھی کر دکھایا جب حکومت کی جدید درخواست پر ہندوستان کے سرکاری وغیر سرکاری افراد نے مل کر اس مشترکہ کام کے لئے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دی اور ملک کے تمام تر وسائل سلطنت برطانیہ کے سامنے پیش کر دیئے۔

جنگ کے ابتدائی ایام میں ہندوستان نے جو بیش بہا خدمات انجام دی تھیں اس کا اندازہ سابق وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی دارالامرا کی جولائی ۱۹۱۷ء والی تقریر کے مندرجۂ ذیل اقتباسات سے ہوگی:۔

"اگست اور ستمبر کے ابتدائی ہفتہ میں کہ دو ڈویژن کی ہندوستانی ہمی فوج فرانس بھیجی گئی جہاں وہ ٹھیک وقت پر جگہ پر کرنے کو پہونچ گئی جو کسی دوسری طرح پر نہیں ہوسکتی تھی، اور وہیں ان کے خون نے برطانوی سلطنت سے ہندوستان کے اتحاد کو مستحکم تر کر دیا۔ جب ہندوستان میں رہنے والی فوج کا ان افواج سے جو مختلف مہموں میں سمندر پار بھیجی گئیں، موازنہ کیا جاتا ہے اس وقت پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان نے فوجی حیثیت سے حکومت کو مدد دینے میں کسقدر مستعدی کی ہے، ہندوستان کی برطانوی فوج میں سے برطانوی سواروں کے (۹) رجمنٹوں میں سے سات، (۵۲) پیادہ پلٹنوں میں سے (۴۴) اور (۵۶) شاہی توپخانے کے دستوں میں سے (۴۳) سمندر پار بھیجدیئے گئے تھے۔ اسی طرح دیسی پلٹنوں میں سے ۳۹ سواروں کے دستوں سے (۲۰) اور (۱۳۸) پیادہ دستوں سے (۹۷) سمندر پار روانہ کر دیئے گئے، جنگ شروع ہونے کے مہینوں بعد، ہندوستان کو ان افواج کے بدلے (۲۹) ٹریٹوریل توپخانے اور (۳۴) ٹریٹوریل پلٹنیں ملیں، یہ ایک واقعہ ہے کہ ان افواج کے آنے سے چند ہفتہ پہلے ہندوستان میں برطانوی فوج صرف پندرہ ہزار رہ گئی تھی اس طرح حکومت کے عام خطرہ کے وقت خود ہندوستان کی حفاظت کو خطرہ میں ڈال دیا گیا تھا، ایسے معاملے میں فطرۃً میں تمام ذمہ داریاں لینے کو تیار تھا اور میں نے یہ تمام ذمہ داریاں پورے اعتقاد کے

ساتھ لیں کیونکہ مجھے ہندوستان کے باشندوں پر اعتماد تھا اور میں نہایت فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے ان پر جو بھروسہ کیا تھا اس میں بالکل صحیح تھا۔"

لارڈ ہارڈنگ نے اپنی اس تقریر میں ان افسروں اور آدمیوں کی جو سمندر پار بھیجے گئے مجموعی تعداد دو لاکھ دس ہزار بتائی ہے اختتام جنگ کے قبل ہی یہ تعداد دوگنی ہو چکی تھی، ہندوستان نے تمام دوران جنگ میں جتنے آدمی سمندر پار روانہ کئے ان کی تعداد ۰۰۰،۴۵،۷۰ تھی ان میں سے ۰۰۰،۵۲،۵ جنگجو تھے اور ۰۰۰،۹۱،۳ غیر جنگجو اور ان موخرالذکر میں وہ لوگ بھی ہیں جو مزدور دستوں میں شریک تھے۔

مختلف اقسام کے سامان جنگ کے مہیا کرنے میں ہندوستان نے بیش بہا بروقت خدمات، انجام دیں اور اس کے ذرائع آمدنی کو دیکھتے ہوئے اس کی مالی امداد کا حصہ بہت زیادہ شاندار رہے۔ ہندوستان میں قبل از جنگ کے معیار کے اعتبار سے فوج کا سالانہ خرچ ۰۰۰،۰۰۰،۲۰ پونڈ ہے، اس مقررہ خرچ کے پورا کرنے کے ساتھ ہی ہندوستان نے نہ صرف ان ہندوستانی فوجوں کے جو سمندر پار لڑ رہی تھیں اخراجات ادا کئے، بلکہ مختلف محاذ ہائے جنگ میں لڑائی کے وقت جو کچھ خرچ ہوا اس کا بھی کفیل ہوا، یہ اس خاص رقم کے علاوہ ہے جو برطانوی خزانہ سے ادا کی گئی اور اسی خزانہ کے ذمہ ہندوستان میں مزید فوج کے داخلہ و قیام کے اخراجات بھی عائد کئے گئے۔ ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی مجلس مقننہ کے غیر سرکاری ارکان کی منظوری کے بعد ۰۰۰،۰۰۰،۴۵ پونڈ کی جو قسط دی گئی، اس کو ملا کر ہندوستان کی مدد ۰۰۰،۰۰۰،۱۴۰ پونڈ تک پہنچتی ہے۔

ہندوستان کی اصلی مالی امداد کا تذکرہ تو ابھی باقی ہی ہے یہ ۱۹۱۷ء میں جبکہ حکومت ہند نے ۰۰۰،۰۰۰،۱۰۰ پونڈ کے قرضہ جنگ کی ذمہ داری لی اس وقت اس رقم کا ایک بڑا حصہ ہندوستان میں قرضہ جنگ کی شکل میں وصول کیا گیا اور اب کل سود اور "ذخیرۂ ادائی" جس کی تعداد ۰۰۰،۰۰۰،۶ پونڈ تک پہونچتی ہے، ہندوستان کی آمدنی سے لیا جاتا ہے۔

مختصراً یہ ہیں ہندوستان کے کارنامہائے جنگ، اور یہی وہ چیز ہے

جو نہ صرف انگلستان کو بلکہ تمام برطانوی حکومت کو اس کا زیر بار احسان بناتا ہے۔
اگرچہ محاذ جنگ سے ہندوستان بہت دور تھا لیکن مشترکہ خطرہ و مشترکہ مقصد میں حصہ لینے کی وجہ سے ہندوستان پر جو دور رس اخلاقی اثر پڑا اوسے نظر انداز نہ کرنا چاہئیے یوروپی میدان ہائے جنگ میں برطانوی و ہندوستانی افواج کی رفاقت جنگ نے ان کے قومی خودداری کے احساس کو بہت بڑھا دیا۔ ان سیاسی رہنماؤں کا جو برسوں سے ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کر رہے تھے، وثوق بہت بڑھ گیا کہ وہ اپنے مطالبہ میں سچے ہیں لیکن اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان کا قومی مرتبہ بلند ہو گیا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لڑائی شہنشاہی پیش قدمی کے خلاف قومی آزادی کی حمایت میں اور مطلق العنانی کے مقابلے میں عمومیت اور ان تمام خیالات کی طرف سے جو عمومیت سے متعلق ہیں لڑی گئی تھی"۔
سنہ ۱۹۱۶ء میں ہندوستان کی اصلاح پسند جماعت نے جو بیان شائع کیا تھا اس کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق صورت حال کا نہایت عمدہ طور پر اندازہ ہو سکتا ہے[لہ]:-

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جنگ کا خاتمہ تمام متمدن دنیا کی حکومتوں کے عموماً اور برطانوی حکومت کے نصب العین میں خصوصاً عظیم الشان ترقی دیکھے گا اس لئے کہ برطانوی حکومت اس جنگ میں صرف چھوٹی اور کمزور قوموں کی حفاظت کے لئے داخل ہوئی ہے اور دنیا کے بین الاقوامی تعلقات میں صرف انصاف و انسانیت کی حمایت کے لئے اپنا بے حد قیمتی خون اور خزانہ لٹا رہی ہے"۔

"اس آزمایش کے وقت ہندوستان کے باشندوں نے اپنے اور حکومت کے آپس کے تمام اختلافات کو نظر انداز کر دیا ہے اور نہایت وفاداری و استقامت سے حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہندوستانی سپاہی

لہ یادداشت جسے اصلاحات بعد از جنگ کے متعلق ہندوستانی مجلس مقننہ کے ۱۹ غیر سرکاری ارکان نے والیسرائے کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

فرانس کے میدان جنگ میں جانے کے لئے بیقرار تھے لیکن یہ اس لئے نہیں کہ وہ اس کے لئے تنخواہ پاتے ہیں بلکہ برطانوی حکومت کے رجیسے ان کی خدمات کی ضرورت تھی) آزاد شہریوں کی حیثیت سے اور ہندوستان کی عام آبادی میں صرف ایک جذبہ موجزن تھا اور وہ یہ کہ انگلستان کی اس ضرورت کے وقت اس کا ساتھ دیا جائے۔ جس وقت ہندوستان برطانوی اور ملکی دونوں فوجوں سے عملاً خالی تھا ملک میں مکمل امن و امان کا راج تھا"

"ہندوستان اپنی وفاداری کے لئے کوئی صلہ نہیں چاہتا لیکن اسے یہ توقع رکھنے کا حق ہے..... کہ آئندہ اسے ماتحت نہیں سمجھا جائیگا بلکہ اسے ایک رفیق اور ساتھی کی حیثیت دی جائیگی۔

"اب جس چیز کی ضرورت ہے وہ محض اچھی حکومت اور باقاعدہ انتظام نہیں ہے، بلکہ ایسی حکومت کی ضرورت ہے جو لوگوں کے لئے قابل قبول ہو اور انھیں کے سامنے ذمہ دار ہو۔

اس جدید مرتبہ کی پہلی تصدیق جو ہندوستان نے برطانوی حکومت سے حاصل کیا دوسری سواراجی قلمروؤں کے ساتھ ایک ہی اصول پر ہندوستان کے نمائندوں کے شہنشاہی کانفرنس میں داخلے سے ہوئی۔ نوآبادیوں کی شہنشاہی کانفرنسوں میں (جن میں سے پہلی ۱۸۸۷ء میں منعقد ہوئی تھی) وزیر ہند یا دفتر حکومت ہند کا کوئی رکن کبھی کبھی شرکت کرتا تھا اور اس نے ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۱ء میں دونوں مرتبہ کی کانفرنسوں کی کارروائی میں حصہ بھی لیا تھا لیکن خود ہندوستان کے لئے کوئی مسلمہ جگہ کانفرنس میں نہ تھی۔ اولیں شہنشاہی موتمر جنگ میں جو ۱۹۱۷ء میں منعقد ہوئی تھی ہندوستان کے چار نمائندوں نے شرکت کی، یعنی وزیر ہند اور سر جیمس مسٹن نے سرکاری حیثیت سے اور سر ستیندر ناتھ (بعدہ لارڈ) سنہا نے برطانوی ہند کے غیر سرکاری رکن کی حیثیت سے اور مہاراجہ بیکانیر نے ہندوستانی ریاستوں کے نمائندہ کی حیثیت سے۔ یہ سب کے سب شہنشاہی کابینۂ جنگ کے بھی ارکان تھے جو ایک چھوٹی سی شہنشاہی مجلس جنگ تھی۔ دوسرے سال کی شہنشاہی موتمر جنگ اور پیرس کی صلح کانفرنس میں بھی ہندوستان کو نشست کا حق دیا گیا

اور دیگر قلمروں کی طرح ہندوستان بھی صلحنامہ ورسائی کے اور معاہدۂ مجلس اقوام کے ابتدائی دستخط کنندوں میں ہے انجمن اقوام کے اجلاس جمعیت میں ہندوستان کے نمائندوں نے شرکتیں کی ہیں، اور اسی طرح واشنگٹن کانفرنس میں بھی رائٹ آنریبل سرینواس شاستری نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔

برطانوی ہند نے جو خدمات ایام جنگ میں کیں انکے تذکرہ کے وقت دیسی حکمرانوں کے جوش وفاداری اور ذوق شرکت عمل کو نہ بھلا دینا چاہئے، ان کی یہ خدمات مسلمہ ہیں، اور اب دیسی ریاستیں ہندوستان اور برطانوی حکومت کے سیاسی نظام حکومت میں ایک نمایاں مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ جنگ کے بعد ۱۹۲۱ء میں جو اولین شہنشاہی کانفرنس ہوئی اس میں سابقہ کانفرنسوں کی طرح ایک جگہ دیسی ریاستوں کے نمائندہ کے لئے بھی مخصوص رکھی گئی اور اس کے ساتھ ہی اس سال کے ابتداء میں ڈیوک آف کناٹ نے خود ہندوستان آکر شہنشاہ معظم کی طرف سے حکمرانوں کے مخصوص "نریندر منڈل" کا افتتاح کیا تھا۔ یہ ایوان تبادلۂ خیالات اور باہمی مشورہ کی مجلس ہوگی جس کے ذریعہ ایک طرف تو تمام دیسی ریاستیں ایک دوسرے سے اور دوسری طرف حکومت ہند سے قریب تر ہوتی جائیں گی، اسکے افتتاح کے موقع پر ڈیوک آف کناٹ نے جو تقریر کی تھی اس میں انھوں نے کہا تھا۔

"یور ہائنسز! میں نہایت ہی پرخلوص مسرت کے ساتھ آپ کو اس مرتبہ کے لئے جو جماعتی حیثیت سے خود اپنے لئے آپ نے حکومت کی وسیع تر مجالس میں حاصل کیا ہے، مبارکباد دیتا ہوں مجلس کابینۂ جنگ اور شہنشاہی کانفرنس میں آپ کی نمائندگی ہوچکی ہے، آپ ہی میں سے ایک نے ۱۹۱۹ء کی مجلس صلح میں حصہ لیا ہے اور صلحنامہ ورسائی پر ان کے دستخط ثبت ہیں اور حال ہی میں آپ ہی میں سے ایک اور نے جنیوا میں جمعیت انجمن اقوام کے اجلاس میں شرکت کی ہے"!

امسال (۱۹۲۲ء) کے ابتدا ہی میں دیسی حکمراں کی فوجی طاقت کی تصدیق کے لئے ایک اسکیم پر عمل درآمد شروع ہوا ہے جس کے ذریعہ سے وہ فوجیں

جو اندرونی انتظامات کے لئے رکھی جاتی تھیں اور وہ فوجیں جو جنگی خدمات کے لئے نہیں (اور جو افواج خدمات شاہی کے نام سے موسوم تھیں) انڈین اسٹیٹ فورسز (افواج ریاست ہائے ہند) کے نام اور افواج حکومت ہند کی ایک شاخ کی حیثیت سے متحد کر دی گئی ہیں۔ یہ جدید حکمت عملی دراصل دیسی ریاستوں کی ان فوجی خدمات کا جو انھوں نے گزشتہ ایام میں عموماً اور جنگ عظیم میں خصوصاً انجام دی ہیں گویا مخلصانہ اقبال تھا۔

گزشتہ جنگ نے جو مخصوص پس منظر پیدا کر دیا تھا، اس کو ایک حد تک پیش کرنے کے بعد مسٹر مانٹیگو کے بیان کو اس کے اپنے رنگ میں دیکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔ ابھی جنگ کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انگلستان و ہندوستان دونوں ملکوں کے مدبرین کو یہ صاف نظر آرہا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی مرتبہ میں ایک نمایاں مادی انقلاب ناگزیر ہے۔ باب سوم میں میں نے اصلاحات کی مختلف اسکیموں پر روشنی ڈالی ہے اور اب جدید اصلاحات نے سنہ ۱۹۱۹ء کے قانون ہند کی صورت اختیار کر لی ہے۔ برطانوی و ہندوستانی حکومت کا تجاویز اصلاحات کو اختتام جنگ تک غور و فکر کے لئے ملتوی نہ رکھنا بلکہ اس کی بجائے انھیں فوراً عملی جامہ پہنانے کا عزم کر لینا اس سے اس مسئلہ کی اہمیت اور انگلستان کی اپنی نیت کے اظہار کی مخلصانہ کوشش کی بہترین دلیل ہے۔

---

(۵)

آئیے اب ہم ایک مرتبہ پھر مسٹر مانٹیگو کے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے بیان کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی دفعات کا تجزیہ کریں تاکہ ہم کو صحیح طور سے یہ معلوم ہو جائے کہ پارلیمنٹ نے کیا کیا وعدے کئے تھے اور پھر دیکھیں کہ کس طرح پارلیمنٹ نے ان وعدوں کا ایفا کیا ہے۔

سب سے پہلے پارلیمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسی حکمت عملی اختیار کرے گی جس سے ملک کے انتظام میں ہندوستانیوں کی شرکت بڑھتی جائیگی۔ اس کا عملاً یہ مطلب ہوا کہ سرکاری اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان اس وقت تک حکومت خود اختیاری کے قابل نہیں ہوسکتا جب تک ملکی ملازمتوں کے اعلیٰ عہدہ داروں میں ہندوستانیوں کی اکثریت نہ ہو جائے اور اس کے برعکس اس وقت برطانوی حکام کا غلبہ ہے۔ ایک ایسی حکمت عملی کا اختیار کرنا جس کی اصلی غایت ہندوستان کی خود مختاری ہو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہندوستانیوں کو خدمات ملکی میں معتدبہ حصہ نہ مل جائے[1] اس سلسلہ میں جو کارروائیاں کی گئیں ہیں ان کا مفصل تذکرہ کسی دوسری جگہ ہے۔[2]

دوسری بات جس کا پارلیمنٹ نے وعدہ کیا تھا وہ ہندوستان میں ادارات خود اختیاری کی تدریجی ترقی تھی۔ یہ کوئی نئی حکمت عملی نہ تھی کیونکہ ۱۸۶۱ء ہی سے جب مجالس مقننہ میں غیر سرکاری ارکان جن میں ہندوستانی بھی شامل تھے داخل کر لیے گئے قصداً یا بلا قصد اس اصول کی پیروی ہو رہی تھی بہرحال اس میں جو چیز نئی ہے اور برطانیہ کی حکمت عملی متعلق ہندوستان کو ایک جدید شکل میں پیش کرتی ہے وہ اس کا **اقرار** ہے کہ خود اختیاری ادارات کے ارتقا کی غایت حکومت ہند کا مقصد ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ ہندوستان کے ملکی انتظامات میں، ہندوستانی، برطانیہ کے شریک

---

[1] ملاحظہ ہو متحدہ رپورٹ پارہ ۳۱۴ [2] ملاحظہ ہوں آئندہ صفحات ۱۳۱ - ۱۲۷ -

ہی تہ ہوں گے (جو گزشتہ زمانہ میں اگرچہ الفاظ کے ذریعہ صاف ظاہر نہیں کی گئی تھی لیکن حکمت عملی رہی ہے) بلکہ خود ہی حکومت کی ہدایت نگرانی کریں گے۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ نے یہ بھی ذمہ لیا کہ "وہ اس سلسلہ میں موثر کارروائی" جلد سے جلد شروع کریگی اور اس طرح اس نے اس بات کا گویا وعدہ کیا کہ واقعی سوراج کا کوئی نہ کوئی جزو ہندوستان کو فوراً عطا ہونا چاہئے۔

قبل اس کے کہ ہم اس پر غور کریں کہ اس وعدہ کی اصلی ماہیت کیا تھی اس کا کس طرح ایفا کیا گیا، یہ دیکھ لینا مناسب ہے کہ کن شرائط کے تحت ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کا منشور عطا کیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شرائط نہایت غور و فکر کے بعد لگائی گئی ہیں اور دستوری نقطۂ خیال سے ان کی اہمیت اتنی زیادہ سمجھی گئی ہے کہ ان کو قانون (اصلاحات) حکومت ہند کی تمہید میں ضبط تحریر کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلی یہ شرط لگائی گئی ہے کہ ذمہ دارانہ حکومت خود اختیاری کے حصول کی ترقی صرف تدریجی طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ قسطوں کے ذریعہ دیجا سکتی ہے؛ دوسری شرط یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی فلاح و ترقی کی آخری ذمہ داری پارلیمنٹ پر ہے اور اس کا حق صرف پارلیمنٹ ہی کو حاصل ہے کہ وہ ہر آئندہ قسط کا موقع و مقدار مقرر کرے[1]۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ کا تصفیہ ہندوستان کی سیاسی ترقی پر منحصر ہوگا اور پارلیمنٹ اپنے کام میں (قانون کے تمہیدی الفاظ میں) ان لوگوں کے تعاون و تعاون کی رہنمائی پر عمل کرے گی جنکو ان خدمت کے انجام دینے کے جدید مواقع عطا کئے گئے ہیں اور اس کا پیمانہ اس کا یہ احساس ہوگا کہ کس حد تک ان لوگوں کی ذمہ داری پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں شرط یہ ہے کہ خود اختیار برطانوی ہندوستان جس کا قانون کی تمہید میں تذکرہ کیا گیا ہے، ایک ایسا ہندوستان ہوگا جو برطانوی حکومت کا ایک لازمی جزو ہوگا کہ اس شرط کی غایت قلمروؤں کا

---

[1] یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ۲۰ اگست کے بیان میں ظاہر کیا گیا تھا کہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند ہر دستوری ترقی کا موقع و مقدار مقرر کرینگے لیکن قانون نے اس اہم ترین فرض کو بلند ترین صاحب اختیار پارلیمنٹ کے قبضے میں دیدیا۔

سا سوراج ہو گا نہ کہ کامل آزادی۔

دار العوام میں اپنے اس بیان کے تین مہینے بعد مسٹر مانٹیگو خود ہندوستان آئے اور یہاں موسم سرما میں وزیر ہند اور وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے اس مسئلہ کا مکمل طور سے مطالعہ کیا۔ ان کی رپورٹ جو سرکاری کاغذات میں لارڈ ڈرہم کی مشہور برطانوی شمالی امریکہ کے مرتبہ کی ہے، امئی ۱۹۱۸ء میں مرتب ہوئی اور جولائی میں شایع ہوئی۔

اس کے بعد کے بارہ مہینے بھی اسی دستوری تگ و دو میں صرف ہوئے جاڑوں کے موسم میں لارڈ ساؤتھ برو کی صدارت میں دو کمیٹیاں مقرر کی گئیں، ایک کا مقصد ایک جدید حلقہ جات رائے دہندگی کے بنیادی اصول کی تلاش و ساخت تھی اور دوسری کا کام صوبوں اور مرکزی حکومت کے فرائض و حقوق کی تقسیم کے پیچیدہ مسائل کا سلجھانا اور اختیارات کا تغیر و تبدل کرتا تھا! ایک تیسری کمیٹی لارڈ کریو کے ماتحت مقرر کی گئی جس کا مقصد انگلستان میں حکومت ہند کے متعلق مباحث کا فیصلہ تھا، یعنی برطانوی حکومت اور وزیر ہند میں یا وزیر ہند اور اس کی مجلس کے آئندہ کیا تعلقات ہوں گے اور دفتر ہند کو کس طرح دوبارہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت ہندوستانی و مقامی و مرکزی حکومتیں عملی ملکی انتظامات کے نقطۂ نگاہ سے تمام تجاویز پر عملی تبصرہ کرنے میں مصروف کار رہیں۔

۲۹ مئی ۱۹۱۹ء کو مسٹر مانٹیگو نے مجوزہ اصلاحات کی اسکیم دار العوام میں پیش کی ابتدا جولائی ہی میں، اسے ایک زبردست منتخب شدہ جماعت کے حوالہ کر دیا گیا جس میں دونوں ایوانوں کے نمائندے اور تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندے شریک تھے اور جس کے صدر لارڈ سیل بورن تھے۔ اس مشترکہ منتخب شدہ کمیٹی کے سامنے تمام سرکاری عہدہ داروں کی رائیں پیش ہوئیں اس کے ساتھ ہی اس نے ہر خیال کے گواہوں کی شہادتیں لیں جن میں ہندوستان کی تمام اہم جماعتوں کے قائم مقاموں کی رائیں بھی تھیں۔ اس کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق ترمیم ہو کر اس مسودہ نے دونوں ایوانوں سے منظور ہو کر ۲۳ دسمبر ۱۹۱۹ء

کو شاہی منظوری حاصل کرلی۔

اس سنہ ۱۹۲۰ء کا بیشتر زمانہ اس قانون کے ماتحت ضروری قواعد وضع کرنے اور رائے دہندوں کے نقشے تیار کرنے میں گزر گیا، اس کام کی تکمیل کے بعد، نومبر سنہ ۱۹۲۰ء میں انتخاب کا موقع ملا اور جنوری سنہ ۱۹۲۱ء میں اصلاح شدہ نظام حکومت نے عملی صورت اختیار کرلی۔

اصلاح شدہ دستور پر ہم نے باب ۔ میں تفصیل سے بحث کی ہے، یہاں صرف ایک سرسری خاکہ پیش کرنا مقصود ہے۔

بہتر ہوگا کہ ابتدا ہی میں ہم اس اصلاح شدہ نظام حکومت کے اس حصہ میں جو مستقلاً قائم رہیگا اور جو صرف عارضی طور پر ہے امتیاز کرلیں، ایسی مستقل بنیادیں بھی رکھدی گئی ہیں جن پر پارلیمنٹی حکومت خود اختیاری کی مکمل عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے وفاقی حکومت کا نمونہ پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس کا بنیادی اصول صوبوں کے اندرونی معاملات میں ان کی مکمل آزادی ہے۔ اصلاحی قانون کی تمہید میں اس قسم کی بنیاد کی ضرورت کا اعتراف کیا گیا ہے، اس کی آخری دفعہ یہ ہے:-

"ہندوستان کے صوبوں کے ادارات خود اختیاری کی تدریجی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ یہ ضرور ہے کہ ان صوبوں کو حکومت ہند کی طرف سے انتہا درجہ کی آزادی دیجائے اور یہ موخر الذکر کی اپنی ذمہ داریوں کی صحیح ادائی کے اصول کے موافق ہوگا۔"

پس اولیں اصلاح اور وہ اصلاح جس پر دوسری اصلاحوں کی بنیاد ہے، مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے مناسب اور مالیات کی تقسیم ہے۔ اس تقسیم سے سنہ ۱۸۳۳ء کی اختیار کردہ حکمت عملی کے خاتمہ کا اعلان ہوتا ہے، وہ حکمت عملی یہ تھی کہ ہندوستان تمام نظام حکومت و مالیات کو مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا جائے، گو عملاً اس اصول میں بہت کچھ ترمیم کر دی گئی۔

اصلاح شدہ نظام حکومت کا ایک اصول وہ نظام ۔ اسے دبی ہے جس پر جدید انتخابی مجالس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس میں تین سرکاری مجالس زیر بحث ہیں یعنی صوبہ کی مجلس مقننہ، جمعیت مقننہ (یعنی تمام ہند کے جماعت مقننہ کا ایوان زیریں) اور مجلس مملکت (یعنی تمام ہند کی جماعت مقننہ کا ایوان بالائی) - ان مجالس میں سے ہر ایک بلاواسطہ انتخاب کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس لئے کہ سنہ ۱۹۰۹ء میں جو بالواسطہ

انتخاب کا طریقہ رائج کیا گیا تھا وہ مفید و تشفی بخش ثابت نہیں ہوا۔ ۱۹۰۹ء کے مجالس میں نمائندوں کی اکثریت خاص خاص طبقوں کے مفاد کی حفاظت کرتی تھی۔ اب موجودہ مجالس میں اس قسم کے نمائندوں کی ایک بہت ہی محدود تعداد ہے اور اکثریت عام حلقہائے انتخاب کی طرف سے منتخب ہوتی ہے۔ جدید مجالس کے کل ارکان میں سے ۵/۷ (مجلس مملکت میں ۳/۵) ارکان منتخب شدہ ہیں یا اس کے برعکس ۱۹۰۹ء کی مجالس میں (علاوہ بنگال کے) ارکان کی اقلیت منتخب شدہ تھی۔ سب سے آخری بات یہ ہے کہ وہ سرکاری عہدہ دار جو ۱۹۰۹ء کے مجالس میں غالب رہتے تھے اب جدید مجالس میں تعداد کی حیثیت سے بہت ہی معمولی اقلیت کے مالک رہ گئے ہیں۔ مختصراً جدید مجالس اگرچہ پورے طور سے نہیں لیکن پھر بھی بڑی حد تک نمائندہ قسم کی پارلیمنٹی مجالس ہو گئی ہیں۔

ہر صوبہ میں تین مختلف مجالس کے اعتبار سے رائے دینے والوں کی تین قسمیں ہیں ہر حلقۂ رائے دہی کا معیار حقوق مالکانہ پر مبنی ہے، اس میں سب سے ادنیٰ قسم کا معیار وہ ہے جو صوبہ کی مجالس مقننہ کے لئے ہے، اس کو اس حد تک عام کر دیا گیا ہے کہ بہتر قسم کی کسان جماعت اور شہر کے معزز اوسط طبقہ کے لوگ شریک ہو سکیں، لیکن، اس کے ساتھ ہی یہ لحاظ بھی رکھا گیا ہے کہ یہ اس قدر عام نہ ہو جائے کہ رجسٹر بے کار ناموں سے پر ہو جائیں اور یہ عمارت اس ابتدائی بوجھ ہی سے بیٹھ جائے مجموعی حیثیت سے ۵۰۰،۴۳،۵۴ اشخاص کو رائے دینے کا حق حاصل ہوا ہے[1] اور یہ تعداد ملک کی مادی ترقی کے ساتھ خود بخود بڑھیگی۔ کل اس آبادی (۰۰۰،۰۰۰،۴۳،۲) تئیس کروڑ نفوس کا جو اصلاحات سے متاثر ہوئی ہے ۲.۵ فیصدی یعنی عاقل و بالغ مردوں کے تقریباً دس فیصدی کو رائے دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے تعلیم کی کوئی شرط نہیں ہے اور جاہل رائے دہندوں کی سہولت کے لئے مختلف رنگ کے صندوق اور اسی قسم کی دوسری ترکیبیں کی جاتی ہیں۔

---

[1] یعنی صوبوں کی مجالس مقننہ کے لئے یا جمعیت مقننہ کے لئے رائے دینے والوں کی مجموعی تعداد ۹،۰۸،۷۴ ؛ ہے اور مجلس مملکت کے لئے ۱۷،۳۶۴ ہے۔

اگرچہ ہندوستانی کسان اکثر جاہل اور سادہ لوح ہوتا ہے، لیکن اپنے مادی فائدہ کے موقع پر بڑا ہی چالاک ہے اور انشاء اللہ بہت جلد جب وہ امیدوار کا جس پر وہ بھروسہ کر سکتا ہے اور جو اس کے نزدیک ایمانداری سے صوبہ کی مجلس میں اس کے مفاد کی حفاظت کریگا، اس امیدوار سے جسے صرف اپنا ہی مفاد مد نظر ہے امتیاز کرنا سیکھ لیگا اور اسے صحیح طور پر اپنی رائے کا استعمال کرنا آجائے گا، تو کسانوں کی سیاسی تعلیم خوب ترقی کریگی اور نیابتی ادارات مضبوط و مستحکم ہو جائیں گے۔

رائے دہندوں کی دوسری جماعت وہ ہے جو مرکزی جمعیت مقننہ کے امیدواروں کے لئے رائے دے سکتی ہے، اس میں شرط املاک ذرا کچھ زیادہ ہے، لیکن پھر بھی اس قدر عام ہے کہ جمعیت کو نمایندگی کا رنگ دیا جاسکتا ہے۔ مجلس مملکت جو تمام ہندوستان کے واضع جماعت مقننہ کا دوسرا یا نظر ثانی کرنے والا ایوان ہے، انتظامی تجربے کی قائم مقام ہونے کے علاوہ مالدار اور بڑے زمینداروں کی نیابت کے لئے بنائی گئی ہے۔ اسی لئے جہاں مجلس مملکت کی رائے دہندگی (یا امیدواری) کے لئے املاک کی شرط بلند ہے وہاں رائے دہندگی کا حق ان لوگوں کو بھی حاصل ہے، جنھوں نے کوئی ممتاز قومی خدمت کی ہو مثلاً کسی مجلس مقننہ کے رکن یا کسی مجلس بلدیہ یا مجلس ضلع کے صدر یا نائب صدر رہے ہوں خواہ ان کی شخصی حیثیت کچھ بھی ہو۔

اب اس تمام عمارت کو مجموعی حالت سے لیجئے تو اس کا ایک حصہ جو مستقل ہے وہ ہے جو جدید عمومی نقشہ پہ بنایا گیا ہے جس کے اصول پر اصلاحی نظام حکومت کی بنیاد رکھی گئی ہے، اور دوسرا حصہ مطلق العنان جماعت کے قدیم اصول کے مطابق ہے۔ یہ موخر الذکر حصہ اس عمارت کا عارضی جز ہے۔

جس طرح مرکزی اور صوبوں کی حکومتوں کے کاموں کو بانٹ دیا گیا ہے، اسی طرح صوبوں کے محکموں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن میں سے ایک کو شعبہ جات محفوظہ کہتے ہیں اور دوسرے کو شعبہ جات مفوضہ اسی اصول پر صوبوں کی حکومت "دو عملی"[۱] (Dyarchy) کہلاتی ہے۔

[۱] ملاحظہ آئندہ صفحہ ۹۸۔

قایم ہے شعبہ جات مفوظہ کو ہندوستانی وزراء کے انتظامی تحت میں دیدیا گیا ہے، جو پارلیمنٹی اصول کی بنا پر صوبہ کی مجلس مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں[1]۔ ان شعبوں میں بتفصیل ذیل محکمے شامل ہیں:-

۱۔ تعلیم (۲) آبکاری (۳) صفائی و حفظان صحت (۴) زراعت و صناعت کی ترقی و توسیع (۵) عمارات و شاہراہ (۶) حکومت خود اختیاری۔

صوبہ کی حکومتوں نے ان محکموں میں فی الحال حکومت خود اختیاری رائج کی گئی ہے۔ اور مرکزی حکومت ہند کو کوئی دستوری حق ان میں مداخلت کرنے کا باقی نہیں رہا اور ان محکموں سے متعلق نہ صرف حکومت ہند بلکہ خود برطانوی پارلیمنٹ کے اختیارات بھی اس سے منتقل ہوگئے ہیں۔ یہ ہے در اصل وہ عظیم تبدیلی جو اصلاحات نے پیدا کی ہے صوبہ داری حکومت کے شعبہ جات مفوظہ کے سلسلہ میں برطانوی افسر ایک حاکم کی حیثیت سے گویا دست بردار ہو گیا ہے، اور اس کی جگہ پر ایک ہندوستانی وزیر کے ہاتھ میں جو ہندوستانی مجلس مقننہ کے سامنے جواب دہ ہے، اس شعبہ کی لگام آگئی ہے[2] جو غلطی بھی ہوگی، اس کا الزام برطانوی افسر کے سر نہ تھوپا جائیگا، بلکہ ذمہ دار ہندوستانی وزیر اور مجلس مقننہ پر اس لئے کہ اسی مجلس پر ہی وزیر کا دار و مدار ہے، اور یہ انہی کا کام ہوگا کہ شعبہ کی اصلاح کریں جو کچھ بھی کامیابی ہوگی اور جو کچھ بھی ترقی ہوگی اس کا سہرا ان کے ہی سر ہوگا۔

صوبہ کی اس دو عملی حکومت کے باقی نصف حصہ کے شعبہ جات محفوظہ میں سے اہم ترین عدالتوں کا انتظام اور پولیس کی نگہداشت کے محکمے ہیں۔ اس کے ساتھ صوبوں میں امن و امان کے قیام کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے اس لئے کہ گو اس حصہ میں بھی ایک معقول ہندوستانی عنصر شامل ہے، پھر بھی اکثریت و غلبہ برطانوی افسروں ہی کا ہے اور محفوظ محکموں کے لحاظ سے صوبہ کی حکومت اب بھی حکومت ہند اور برطانوی حکومت کے ماتحت ہے، بہرکیف یہ عارضی انتظام ہے۔

[1] ملاحظہ ہو اس باب کے آخر کا حاشیہ

[2] اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو نظر انداز کرنا چاہئے کہ صوبہ کے گورنر کو حق حاصل ہے کہ ان معاملات میں جو اس کے نزدیک اس کی مداخلت کے طالب ہوں وہ وزراء کی رائے کو مسترد کر سکتا ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۹۹۔

اگر یہ عظیم الشان ہندوستان جیسے ملک میں پارلیمنٹی طرز کی حکومت اختیاری کی ترویج کی حیثیت ایک عظیم الشان دستوری تجربہ کی ہی ہو سکتی ہے، اور اگر یہ کامیاب ثابت ہوا، اگر اپنے ایام کار آموزی میں وزراء نے اپنے اندر صحیح قوت فیصلہ و اصول رہبری کو مضبوط کر لیا اور مجالس مقننہ نے اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس پیدا کر لیا تو سوا راج کی دوسری قسط کے صاف معنی شعبہ جات محفوظہ کو وزراء کے حوالہ کر دینے کے ہوں گے۔ یہ عارضی تعمیر جس نے صوبہ کی حکومت کو ایک عجیب ترکیبی شکل دے رکھی ہے، یا لآخر غائب ہو جائیگی اور اس کی جگہ ایک ہی قسم کی حکومت ہو گی جسے صوبہ کے معاملات میں پوری آزادی ہو گی اور یہ تمام تر ایسے وزراء پر مشتمل ہو گی جو مجلس مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

برطانوی پارلیمنٹ نے جس سیاسی دستور کا وعدہ کیا تھا اس کا ایک حد تک سلامتی اور کامیابی کی توقع کے ساتھ صرف اسی طرح تجربہ ممکن تھا، حکومت کی محدود فضا میں جس حد تک بھی حکومت خود اختیاری دی جا سکتی تھی، اس حد تک کی حکومت خود اختیاری کے دینے میں کمی کی جاتی یا اگر ایسے نازک عہد انتقال میں کوئی ایسی مراعات دیجاتی جو حکومت کے رعب کا خاتمہ کر دیتی، یا امن و امان کے بنیادی اصولوں کو جس کے بغیر کسی قسم کی کوئی سیاسی ترقی ممکن نہیں نظر انداز کر دی جاتی تو ان میں سے ہر صورت مہلک ثابت ہوتی۔

اب مختصراً صوبہ کی مجلس مقننہ کے مرتبہ و اختیارات کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے۔ شعبہ جات مفوضہ کے سلسلہ میں جس کے ذمہ دار وزراء منتخب شدہ ارکان میں سے چنے جاتے ہیں، یہ مجلس مقننہ بالکل وہی حقوق رکھتی ہے جو ایک آزاد پارلیمنٹ کو حاصل ہیں شعبہ جات محفوظہ میں بھی جن میں مالیات قانون سازی بھی شامل ہیں مجلس تقریباً اسی قسم کے اختیارات کا استعمال کرتی ہے، لیکن یہ مداخلت محض عارضی ہوتی ہے، اور حکومت صوبہ کے ان محکموں میں اس کے اختیارات محدود ہیں۔ شعبہ جات محفوظہ کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے گورنر کو اس بات کا حق ہے کہ اپنے خیال کے مطابق حکومت ہند اور وزیر ہند کی (جو پارلیمنٹ کا گویا نمایندہ ہے) منظوری کی شرط کے تحت مجلس مقننہ کی خواہش کو بالائے طاق رکھ سکتا ہے۔

وہ اس صورت میں کہ اگر وہ اس بات کا استناد کرے کہ وہ جو مالی یا مقننی کارروائی کرنا چاہتا ہے، وہ کسی محکمۂ محفوظ کے ذمہ دار افسر کے فرائض کے انجام کی حیثیت سے ضروری ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ صوبہ کے اندرونی معاملات کے لئے کامل سوراج نہ مل جائیگا، یا دوسرے الفاظ میں جس وقت تک کہ صوبہ کی حکومت کے تمام محکمے جن میں قیام امن وامان کا بھی محکمہ شامل ہے، ان وزرا کے ماتحت جو مجلس مقننہ کے جواب دہ ہونگے نہ آجائیں گے اس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مجلس مقننہ کو اختیارات تامہ حاصل ہیں۔

اب مرکزی حکومت کی طرف متوجہ ہو جیئے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ اس حکمت عملی کے ماتحت کہ ہر انتظامی شعبہ میں ہندوستانی شریک کئے جائینگے مجلس عاملہ یعنی حکومت ہند میں ہندوستانی عنصر بڑھا دیا گیا ہے، پھر بھی برطانوی افسروں کو غلبہ حاصل ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فوج کے متعلق بعض ضابطہ کی حدوں، خارجی معاملات، یا دیسی ریاستوں کے ساتھ تعلقات کے علاوہ جماعت مقننہ کو جس میں جمعیت مقننہ اور مجلس مملکت دونوں شامل ہیں صوبہ کی مالیات اور قانون سازی میں وہی پارلیمنٹی حقوق حاصل ہیں جو صوبوں کی مجالس مقننہ کو ہیں، تاہم اس کے اختیارات بھی اس حیثیت سے محدود ہیں کہ جس طرح صوبہ کا گورنر محفوظ محکموں کے متعلق اپنے اختیارات استعمال کر سکتا ہے، اسی طرح وائسرائے یا گورنر جنرل بھی اپنی صوابدید پر وزیر ہند اور پارلیمنٹ کی منظوری کے تحت، ایک ایسے معاملہ میں جسے وہ بہت اہم سمجھتا ہے ایک ایوان یا دونوں کی رائے کے بغیر یا اس کے خلاف عمل کر سکتا ہے اور اسی کی طرح اس کارروائی کو مستند قرار دے سکتا ہے۔

پس جہاں ہندوستان کے لئے پارلیمنٹی حکومت اختیاری کی اس طرح اجمالاً بنا ڈالدی گئی ہے وہیں وہ اس وقت تک جماعت مقننہ کو حاصل نہیں ہونگے جب تک کہ (ان باتوں کو محفوظ رکھتے ہوئے جن کا تعلق شہنشاہی مفاد سے ہے ہندوستان کی مرکزی جماعت مقننہ کو کامل اختیارات نہ مل جائیں اور جب تک حکومت ہند کی مجلس انتظامی میں تبدیلی نہ ہو جائے اور وہ ایسے وزرا پر

جو مجلس مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوں مشتمل نہ ہو اس قسم کی تبدیلی میں جو مشکلات ہیں وہ بہت بڑی ہیں اور کم از کم اس وقت تک رہیں گی جب تک صوبوں کی حکومتیں کامل سوراج کے درجہ تک نہ پہونچ جائیں، کیونکہ صوبوں کی خود اختیاری حکومتوں کے قبل حکومت ہند کا ایک بڑا کام صوبوں کی حکومتوں کے ان محکموں کی جو محفوظ ہیں اور جن میں برطانوی افسروں کا غلبہ ہے نگہداشت و ہدایت ہے اور یہی وہ منصب ہے جو مرکزی حکومت کی غیر منقسم توجہ اور غیر منقسم اختیارات کا باعث معلوم ہوتا ہے۔

حکومت ہند کی تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ ذمہ دارانہ حکومت تدریجی ترقی کی آخری منزل تک پہونچ جائیگی، اور اس وقت ہندوستان سلطنت برطانیہ کے اندر کامل سوراج حاصل کر لے گا۔

ذمہ دارانہ حکومت

ایک ایسی جماعت عاملہ کا تخیل جو منتخب شدہ جماعت مقننہ کے سامنے جواب دہ ہو جیسے برطانیۂ عظمیٰ اور سوراجی قلمروؤں کی اصطلاح میں "ذمہ دار" حکومت کہتے ہیں، اہل امریکہ کے لئے کوئی مانوس تخیل نہیں ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں بھی جماعت عاملہ کو عمومیت کے اصول اور قوم کی خواہش کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے لیکن یہاں یہ بالکل ہی مختلف بنیاد پر قائم ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں جماعت مقننہ کے سلسلہ میں ہر دو سال میں اور اعلیٰ جماعت عاملہ کے متعلق ہر چار سال میں قومی رائے ظاہر کی جاتی ہے؛ اس کے خلاف برطانیۂ عظمیٰ میں دارالعوام کے انتخاب کے ذریعے سے (یعنی پانچ سال پر یا پارلیمنٹ کے منتشر کر دینے کی شکل میں اس سے کم وقفہ میں) قومی رائے کا اظہار ہوتا ہے، اور اس کے ہی ذریعہ جماعت عاملہ یعنی وزیر اعظم و مجلس کابینہ کے رویہ کا بھی فیصلہ ہو جاتا ہے صرف اس سیاسی جماعت، یا متحدہ سیاسی جماعتوں کے رہبر جن کی دارالعوام میں اکثریت ہو عہدوں پر قائم ہونے کی توقع کر سکتے ہیں، اور وہ بھی اسی وقت تک ان عہدوں پر رہ سکتے ہیں جبتک

ان کو مالیات اور قانون سازی کے مسائل میں دارالعوام کی اکثریت حاصل ہو۔ اس لئے جماعت مقننہ جو اس زمانے میں قومی رائے کی مظہر ہوتی ہے، حکومت کو بنا اور بگاڑ سکتی ہے، اور اسی مفہوم میں حکومت اس کے یعنی جماعت مقننہ کے سامنے جواب دہ ہے، یعنی پارلیمنٹ کے منتشر ہونے کی حالت میں خود قوم اس سے جواب طلب کر سکتی ہے۔

برطانوی تاج کے ماتحت نوآبادیات کی حکومت کی ایک یہ صورت ہے کہ جماعت مقننہ منتخب ہوتی ہے اور اس طرح نوآبادی کی نیابت کرتی ہے، لیکن جماعت انتظامی ایک گورنر اور ایک مجلس عاملہ پر مشتمل ہوتی ہے، اسے برطانوی حکام مقرر کرتے ہیں، اور وہ نوآبادی کی جماعت مقننہ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتی، اس کو "نیابتی" حکومت کہتے ہیں، اور برطانوی نوآبادیات میں سے اکثر جن کو اب "ذمہ دارانہ" حکومت کی عزت حاصل ہے، اس منزل سے گزر چکی ہیں۔ یہ ایک بہت ہی غیر مستقل قسم کی حکومت ہے، کیونکہ اگر منتخب جماعت مقننہ اور گورنر میں اختلاف ہو جائے تو ان کے اختلافات کو طے کرنے کا کوئی دستوری ذریعہ نہیں ہے اور اگر جماعت مقننہ کو مالیات اور قانون سازی کے کل اختیارات حاصل ہوں تو وہ دستوری حکومت کو بیکار کر سکتی ہے۔ اس قسم کی دستوری گتھی کے سلجھانے کی صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو اسے شاہی نوآبادی کی حکومت کی طرف واپس کر دیا جائے کہ اس حالت میں جماعت مقننہ جو منتخب کی جگہ نامزد ہوتی ہے، ایسے ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جو جماعت عاملہ کے ہمرائے ہو، یا ذمہ دارانہ حکومت کی طرف بڑھا دیا جائے۔ ایسی حالت میں ایک ایسا گورنر جسے برطانوی حکومت مقرر کرتی ہے اور جسے اس قلمرو کی حکومت برخاست نہیں کر سکتی جماعت عاملہ کے برائے نام افسر اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہتا ہے، لیکن اصلی اختیارات ایک وزارت کے قبضے میں ہوتے ہیں، جسے قلمرو کی جماعت مقننہ بنا اور بگاڑ سکتی ہے۔

جزیرۂ مالٹا کے حالات سے نوآبادیات کی حکومت کا ارتقا نہایت عمدہ طریقے سے سمجھ میں آسکتا ہے ۱۸۴۹ء میں مالٹا کے لئے ایک مجلس حکومت

بنائی گئی جس کے اکثر ارکان نامزد کردہ تھے یہ "شاہی نوآبادی" کے نوع کی حکومت تھی ۱۸۸۷ء میں اس مجلس کی از سر نو تعمیر ہوئی اور اس میں منتخب ارکان کی معقول اکثریت شامل کی گئی۔ اس مجلس اور گورنر کے درمیان لاتنا ہی جھگڑوں کے بعد معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ مجلس کے خیال کے مطابق گورنر کی خود رایانہ کارروائی پر صدائے احتجاج کے طور پر مالی مسودات کو منظور کرنے سے انکار اور رقوم کو نامنظور کر کے دستوری حکومت کو گویا مفلوج کر دیا، چنانچہ ۱۹۰۳ء میں اسے اسی شاہی نوآبادی کی حکومت کی طرف جو ۱۸۴۹ء میں قائم کی گئی تھی لوٹا دیا گیا، گزشتہ سال ۱۹۲۱ء میں مالٹا کو ایک جدید سوراجی دستور ملا ہے جو اصول "دوعملی" پر موقوف ہے، اور اس کے مطابق وہ معاملات جن کا اثر شہنشاہی مفاد پر پڑتا ہے، گورنر کے قبضے میں محفوظ ہیں، باقی تمام معاملات کو مالٹی وزراء انجام دیں گے جو ایک منتخب جماعت مقننہ کے جواب دہ ہوں گے۔[۱]

ہندوستان میں اسی قسم کے مسائل کو سلجھانا ہے ۱۹۰۹ء کی مجالس کو بڑھانے اور ان کے اختیارات کو یہاں تک وسیع کرنے میں ان کو جماعت عاملہ پر جو بیشتر برطانوی عمال سے مرکب ہے فوقیت حاصل ہو جائے اس کے معنی یہ ہوتے کہ "نیابتی حکومت میں جو دستوری انجماد پیدا ہو جاتا ہے، اس کا سامان پیدا کر دیا جائے۔ ہندوستان کو "شاہی نوآبادی حکومت" کے درجہ میں رکھنے کا تو خیال بھی ناممکن ہے" تو پھر باقی صورت جسے بالآخر اختیار کر لیا گیا ہے رہ جاتی ہے کہ مخصوص حدود کے اندر رہ کر وہ تمام ذمہ دارانہ حکومت کی طرف ترقی کی جائے، اور یہ صرف "دوعملی" اصول کے اختیار کرنے سے ممکن ہے۔

---

[۱] منقول از لوئل "حکومت انگلستان" جلد دوم باب ۵۶ لوئل نے تمام باتوں کو مختصراً اس طرح ادا کیا ہے "ایک منتخب جماعت مقننہ کے ساتھ ایک دور و دراز کی حکومت کے مقرر کردہ گورنر کو شامل کرنا، اختلافات کے پیدا کرنے اور ان کو دائمی بنانے کی ایک عمدہ ترکیب ہے۔"

باب (۲)

سیاسی و دستوری ترقی سنہ ۱۷۷۳-۱۹۱۲ء

لارڈ نارتھ کے سنہ ۱۷۷۳ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ سے قبل برطانیہ نے ہندوستان میں وہی حکومت قائم کی تھی جس کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان اختیارات کے ماتحت بنا ڈالی تھی جو اسے عہد اسٹوارٹ میں شاہی منشوروں کے ذریعے ملے تھے اور انقلاب کے بعد جن کی پارلیمنٹ نے تصدیق کی تھی۔ یہ ایک ایسی حکومت تھی جس کا ڈھانچا ابتداءً صرف تجارتی مقصد کے لئے تیار کیا گیا تھا اور کمپنی کے ہر مخصوص مرکز میں (جنھیں پریسیڈنسی کہتے تھے) ناظموں کی ایک مقامی مجلس ہوتی تھی جس کا صدر اس پریسیڈنسی کا گورنر ہوتا تھا اور اس مقام کے کمپنی کے سینیر ملازم اس کے ارکان ہوتے تھے۔ یہ مقامی مجالس یا جماعتیں اگرچہ لندن کی مجلس نظماء کے ماتحت ہوئیں لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے آزاد تھیں۔ یہ کمپنی کے تجارتی معاملات کے انتظام کے علاوہ یہ مجالس کمپنی کو عطا شدہ فرامین کی اصطلاح میں عاملانہ مقننانہ اور عدالتی فرائض بھی انجام دیتی تھیں سنہ ۱۶۶۱ء میں ایک نیم آزاد عدالت جس کا تعلق براہ راست تاج برطانیہ سے تھا، سورت (اور بعد ازاں مدراس) میں قائم ہوئی لیکن عدالت و کمپنی کے ملازموں کے درمیان جھگڑوں کی وجہ سے یہ تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا اور عدالت بند کر دی گئی تاہم سنہ ۱۶۸۴ء سے سنہ ۱۷۲۶ء کے درمیان میں مختلف شہروں میں

انگریزی بلدی مجالس کے نمونہ پر سپریم کی عدالتیں قائم کی گئیں جن کو دیوانی مقدمات کا بھی اختیار تھا، اور یہ قرار پایا کہ اُن کی تجاویز کا مرافعہ مجلس کے گورنر یا صدر کے یہاں اور اس کے بعد پریوی کونسل میں ہو سکیگا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں جو جدید علاقہ حاصل کیا تھا اُس کے انتظام کے لئے ۱۷۷۳ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ کے ذریعہ سے ایک نئی قسم کی حکومت قائم کی گئی۔ برطانوی ہندوستان کا دستور جن قوانین پر مبنی ہے یہ قانون اس کی پہلی کڑی تھا۔ سیع، نا قابل انتظام اور نیم تجارتی مجلس کی بجائے جو نئے حالات میں بنگال کے انتظام کے لئے بالکل ہی ناکافی ثابت ہوئی اس ایکٹ کے ذریعہ بنگال کے علاقے ایک گورنر جنرل اور چار ارکان کی ایک مجلس کے زیر انتظام کر دیئے گئے۔ یہ سب ارکین نامزد کردہ تھے اور یہ قرار پایا کہ ان میں سے ہر ایک پانچ پانچ سال تک اپنے عہدہ پر برقرار رہے اور ان کے جانشین لندن کی مجلس نظماء مقرر کرے اسی وقت سے ہندوستان کی مرکزی وصوبجاتی حکومتوں کے ارکان کا زمانہ روایتہً پانچ سال رہتا ہے۔

وارن ہسٹنگز پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس جدید حکومت کا ایک رکن تو اس کا ایک دوست تھا جو اسی کی طرح کمپنی کے یہاں شریک ملازمت تھا، باقی تین براہ راست انگلستان سے آئے تھے، یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ تقریباً دو سال تک وارن ہسٹنگز مجلس کے ان تین ارکان کی مسلسل مخالفت و مزاحمت کو برداشت کرتا رہا اور یہ مخالفت اس قدر بڑھی کہ بعض وقت یہ خوف پیدا ہو جاتا تھا کہ کہیں حکومت مفلوج نہ ہو جائے یہی چیز تھی جسنے لارڈ کارنوالس کو (یہ وہی کارنوالس ہے جس نے ۱۷۸۱ء میں واشنگٹن کے سامنے یارک ٹاؤن میں ہتھیار ڈال دیئے تھے) اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اصرار کرے کہ بنگال میں وارن ہسٹنگز کی جگہ گورنر جنرل ہو کر جانے سے پہلے اس کو مجلس کی رائے کو مسترد کر دینے کا دستوری حق دے دیا جائے، چنانچہ ایک خاص ترمیمی قانون منظور کیا گیا، جس کے ذریعہ گورنر جنرل کو یہ حق دیا گیا کہ اگر اس کی رائے میں کوئی معاملہ کمپنی کے مفاد یا ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے امن و آسائش پر اثر ڈالتا ہے، تو وہ اپنے رفقا کی رائے کو مسترد کر سکتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی شرط لگائی گئی کہ مخالف اکثریت کی رائے

بھی قلمبند کر لی جایا کرے تاکہ صاف طور سے معلوم ہو جائے کہ ذمہ داری کس کے سر ہے ۱۷۹۳ء سے منشوری قانون کے ذریعہ مدراس و بمبئی کی ماتحت پریسیڈنسیوں میں بھی یہی اصول قائم کیا گیا پٹ کے ۱۷۸۴ء کے قانون کے ذریعہ سے ان احاطوں کو بھی بنگال کے نمونہ پر از سر نو ترتیب دیا گیا تھا۔ تاریخی اہمیت کے لحاظ سے اس اختیار کو حقیقی معنی میں صرف ایک مرتبہ یعنی ۱۸۷۹ء میں استعمال کیا گیا جب برطانوی حکومت کے دباؤ سے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ لٹن نے اپنے اختیارات کو کام میں لاکر انگلستان کے روئی کے کپڑوں پر محصول درآمد کا ایک حصہ کم کر دیا۔ اس قسم کے حق کی وجہ سے مرکزی عاملہ کا اقتدار قوی ہو جاتا ہے اسی حق کی بنا پر جو مرکزی عاملہ کو حاصل ہے، مرکزی (یا صوبہ) کی حکومت کا نام گورنر جنرل (یا گورنر) "بہ اجلاس مجلس عاملہ" ہے نہ کہ گورنر جنرل (یا گورنر) "مع مجلس عاملہ"۔ ہندوستان کی اس نادر مجلسی حکومت نے جان اسٹوارٹ مل[1] سے بھی داد حاصل کی ہے، وہ یہ کہ اس کی رائے میں یہ مجلس صرف اپنے ارکان کے تجربہ کارانہ فیصلہ اور توازن سے مستفید ہوتی ہے بلکہ وحدت عمل کی وجہ سے اس میں قوت اور استحکام بھی موجود ہے۔

۱۷۷۳ء میں بنگال کی جدید حکومت کے قیام پر (ملکی اور فوجی معاملات کو نظر انداز کر کے) اکثر تجارتی معاملات ایک مجلس تجارت کے سپرد کر دیئے گئے جو اسی غرض کے لئے بنائی گئی تھی علاوہ ازیں جن لوگوں نے ۱۷۷۳ء کا قانون بنایا تھا ان کا یقیناً یہ بھی خیال تھا کہ حکومت کو عدالت اور قانون سازی کی بعض ذمہ داریوں سے بھی سبک دوش کر دیا جائے۔ اس قانون نے بادشاہ کو یہ حق دیا کہ وہ اپنے فرمان کے ذریعہ بنگال میں ایک عدالت عالیہ قائم کرے جو ایک میر مجلس عدالت اور تین ججوں پر مشتمل ہو اور اس عدالت عالیہ کو (جو ۱۷۷۴ء میں قائم ہوئی) نہ صرف وسیع عدالتی حقوق عطا ہوئے، بلکہ قانون سازی پر بھی ایک خاص طریقے پر اختیارات دئے گئے اس قانون کے ذریعہ گورنر جنرل

[1] مل: ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ (نیابتی حکومت) باب ۱۴۔

اور کونسل کو بنگال کے حسن انتظام و امن کے لئے قواعد احکام وضوابط بنانے کے اختیارات دیئے گئے لیکن وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ وہ باضابطہ عدالت عالیہ کے سامنے پیش نہ ہو جائیں اور وہ انھیں منظور کر کے شائع نہ کر دے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عدالت اور وارن ہسٹنگز اور ان کی حکومت میں بہت جلد اختلافات پیدا ہو گئے ریگولیٹنگ ایکٹ کا مسودہ بہت ہی مبہم اور غیر تشفی بخش تھا اور ۱۷۸۱ء کے ترمیمی (اعلانی) قانون کے ذریعہ سے تقریباً تمام اختلافی مسائل میں گورنر جنرل کی تائید کی گئی۔ عدالتوں کی جن میں عدالتہائے مرافعہ گورنر جنرل اور ان کی کونسل کے ماتحت جملہ عدالتوں کی آزادی تسلیم کی گئی جن میں عدالتہائے مرافعہ بھی شامل ہیں اور ساتھ ہی عدالت عالیہ کے اختیارات کو بہت صریح و محدود کر دیا گیا، ادھر گورنر جنرل اور کونسل کو عدالت عالیہ سے رجوع کئے بغیر قوانین وضوابط بنانے کا اختیار دے دیا گیا، لیکن یہ شرط لگا دی گئی کہ اس کی ترمیم یا نامنظوری کا بادشاہ کو کامل اختیار ہے۔

۱۷۷۴ء میں کلکتہ کی عدالت عالیہ قائم ہوئی اور اسی قسم کی عدالتیں مدراس و بمبئی میں بھی قائم کی گئیں اور یہی عدالتیں ان ہائی کورٹوں کی بنیاد تھیں جو ۱۸۶۱ء میں شاہی فرامین کے ذریعہ قائم کئے گئے۔ انھیں عدالتوں میں اپیل کی ان مختلف عدالتوں کو بھی ملا دیا گیا جو بمبئی میں وارن ہسٹنگز کے زمانہ ہی سے برسر کار تھیں۔

بنگال کی مجلس عاملانہ پٹ کے ۱۷۸۴ء کے قانون کے ذریعہ دوبارہ ترتیب دی گئی اس کے ارکان کی تعداد چار سے تین کر دی گئی جن میں سے ایک سپہ سالار تھا اور دو کمپنی کے سول سروس کے ارکین اسی طرز کی مجالس مدراس و بمبئی میں بھی بنائی گئیں، اس کے بعد سے ۱۸۳۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجدید منشور کے قانون کی منظوری تک حکومت ہند کے دستور عاملانہ میں کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی اس قانون کے ذریعہ سے گورنر جنرل کی مجلس میں ایک چوتھے رکن قانون کا اضافہ ہوا جو کمپنی کا ملازم نہ رہا ہو اور اس عہدہ پر سب سے پہلے مکالے کا تقرر ہوا۔ اسی قانون منشور میں یہ مشہور جملہ تھا کہ "کوئی ہندوستانی صرف اپنے مذہب، مولد، خاندان، رنگ یا ان میں سے کسی ایک سبب سے کمپنی کے کسی عہدہ۔

نوکری یا ملازمت کے نا قابل نہ سمجھا جائیگا"

تاہم ۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعہ سے حکومت ہند میں ایک مرکزی صورت پیدا ہو گئی اور اگرچہ اب یہ نظام حکومت رفتہ رفتہ بدل گیا ہے لیکن اس کا اثر اسی وقت سے برابر محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس وقت تک بنگال کا گورنر جنرل باقی دو چھوٹے صوبوں پر جو اختیارات استعمال کرتا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھے۔ اور جو ۱۸۴۸ء کے قانون ہند کے انفاظ میں صرف ایسے تمام امور کے متعلق تھے، جن کا تعلق دیسی حکومتوں معاملات صلح و جنگ" یا ایام جنگ میں ان پریسیڈنسیوں کی آمدنی یا فوج کے استعمال سے تھا"۔ اب اس اصول میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ مالی نظام نے کامل طور سے مرکزی صورت اختیار کر لی تھی اور لارڈ میو کی حکومت کی ۱۸۷۰ء والی اصلاحات تک صوبہ کی حکومتوں کو تھوڑے بہت آزاد ذرایع آمدنی بھی نصیب نہ ہوئے۔ مدراس اور بمبئی کی حکومتوں سے قانون سازی کے اختیارات لے لئے گئے اور ۱۸۶۱ء تک ان کو واپس نہیں دیا گیا۔ ابتداءً یہ خیال کیا گیا تھا کہ ماتحت صوبوں کی کونسلوں ہی کو یک قلم موقوف کر دیا جائے وہ قائم تو رہیں، لیکن چونکہ ۱۸۳۳ء والے قانون کے ذریعہ سے تعداد ارکان کی تخفیف کا اختیار حاصل ہو چکا تھا اس لیئے ان کی تعداد تین کی جگہ دو کر دی گئی۔ اب بنگال کے گورنر جنرل کا لقب گورنر جنرل ہند ہو گیا اور اس کی حکومت پہلی مرتبہ "حکومت ہند" کے نام سے موسوم ہوئی۔

قانون سازی کے اختیارات کا تمام تر مرکزی حکومت کے ہاتھوں دے دینے کی اور اس طرح تمام برطانوی ہندوستان کے لیئے ایک ہی قانون بنانے کی اصلی غایت وہ خوف تھا جو ہر قسم کے یوروپین اشخاص یعنی تاجروں، مذہبی مبلغوں اور کاشتکاروں کو آزادانہ ہندوستان میں آنے کی حکمت عملی کے نتیجہ کی طرف سے اس وقت تھا۔ ۱۸۱۳ء ہی سے جب کمپنی کی غیر ممالک میں تجارت کرنیکی مراعات منسوخ کی گئیں تھیں، ماتحت یوروپین اصحاب کا داخلہ صرف اجازت ناموں کے ذریعے سے ممکن تھا اور رہا تھا ۱۸۳۳ء میں

کمپنی کے تمام تجارتی معاملات سے دست کشی کے باعث ذرا زیادہ آزادی دیدی گئی تھی چنانچہ یہ خطرہ بہت بری طرح محسوس کیا جا رہا تھا، کہ حکومت کی نگرانی سے آزاد یورپینوں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی اسی وقت تک باعث فساد ہوگی جب تک ایک مضبوط مرکزی حکومت ان کی پوری نگہداشت نہ کرے، ان کو نہ روکے اور ہر قسم کے قانون سازی کے ضروری اختیارات سے مسلح نہ ہو"۔

مجلس گورنر جنرل میں ایک رکن قانونی کے اضافہ میں ہم کو قانون سازی کے اغراض کے لئے مجلس کی تدریجی وسعت کی ابتدا نظر آتی ہے۔ ۱۸۵۳ء تک رکن قانونی کو مجلس کے عاملانہ اجلاس کی شرکت حاصل نہیں ہوئی نہ اسے اس میں رائے دینے کا حق ملا اس لئے کہ اس سے پیشتر اس کی حیثیت صرف قانون سازی کے کاموں کے لئے ایک رکن "زائد" کی تھی ۱۸۳۳ء میں "گورنر جنرل" یا اجلاس کونسل" کے اختیارات قانون سازی کی صاف طور سے تشریح کر دی گئی اور ۱۸۳۳ء کے منشوری قانون کے ماتحت جو قوانین بنائے گئے وہ پہلی مرتبہ "ضوابط" کی جگہ "قوانین" کے الفاظ سے یاد کئے گئے۔

ہندوستان کی اولین مجلس مقننہ ۱۸۵۳ء کے منشوری قانون کے ذریعہ گورنر جنرل کی مجلس کو قانون سازی کے امور کے لئے وسعت دے کر قائم کی گئی۔ گورنر جنرل اور اس کی مجلس عاملہ (یعنی سپہ سالار اور چار ارکان عام) کے علاوہ مندرجۂ ذیل "زائد" ارکان کا صرف قانون سازی کے لئے اضافہ کیا گیا:۔

بنگال کا چیف جسٹس

بنگال کی عدالت عالیہ کا ایک جج

چار ایسے اشخاص جو حکومت کے ملازم رہ چکے ہوں، بنگال، مدراس، بمبئی اور صوبۂ مغربی و شمالی کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کا فرض یہ تھا کہ "گورنر جنرل اور ان کی کونسل کو ان کے عاملانہ حیثیت سے معلومات بہم پہنچایا کریں"۔

مجلس مقننہ کے اجلاس عام ہوتے اور ان کی کارروائیاں شائع کی جاتیں حقیقتہً یہ مجلس ایک چھوٹی سی پارلیمنٹ کی طرح کام کرتی تھی قوانین پر حق استناع دیا گیا،

لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ اس طرح سے جو مجالس مقننہ ترتیب دی گئی تھی وہ تمامتر سرکاری حکام سے مرکب تھی اور کسی ہندوستانی کو اس میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی، پارلیمنٹی مجلس "نگراں" کے صدر سر چارلس وڈ نے اس تجویز کو دارالعوام میں پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہندوستانیوں کو مجالس میں شریک کرنا مناسب نہ ہوگا"۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد بالکل ہی خیالات پلٹ گئے اور حکومت کے بادشاہ کے ہاتھوں آجانے کے تین سال بعد جب ۱۸۶۱ء میں مجالس مقننہ کی از سر نو ترتیب ہوئی تو غیر سرکاری اشخاص کو متعدد نشستیں دی گئیں جن میں ہندوستانی بھی تھے لارڈ کیننگ جن کے ہاتھوں میں غدر کے ایام ظلمت میں ہندوستان کی زمام حکومت تھی، اور جو صرف اس وجہ سے کہ وہ اس افسوسناک واقعہ سے تلخی کی جگہ اصلح و امن کے ثمرات حاصل کرنا چاہتے تھے، "عرفیا رحمدل کیننگ" کے لقب سے موسوم کئے جاتے تھے، ہندوستان میں برطانوی حکمت عملی کی اس تبدیلی کے لئے مستحق داد ہیں چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ برطانوی ہندوستان میں نیابتی ادارات کا بیج انھیں کے ہاتھوں بویا گیا۔

۱۸۶۱ء کے قانون مجالس ہند نے گورنر جنرل کی کونسل کے "زاید" یا قانون ساز ارکان کی تعداد دو چند یا دو گنی کر دی، اور ان میں سے نصف غیر سرکاری رکھے گئے اسی قانون نے مدراس و بمبئی کو بھی قانون سازی کے اختیارات دیئے اور ان جگہوں میں بھی اسی طرز کی مجالس مقننہ قائم کی گئیں گورنر جنرل کو بنگال کے لئے ایک مجلس مقننہ کے قیام کی ہدایت کی گئی اور بعد ازاں ۱۸۸۶ء میں صوبہ شمال و مغربی اور ۱۸۹۷ء میں پنجاب میں اس قسم کی مجالس قائم ہوئیں مقامی مجالس مقننہ کے قوانین کے لئے جہاں گورنر یا لفٹنٹ گورنر کی منظوری کی ضرورت تھی وہیں گورنر جنرل کی منظوری بھی لازمی تھی اور اس قسم کے تمام قوانین اور ان قوانین کو جو گورنر جنرل کی کونسل میں منظور ہوئے ہوں "وزیر ہند باجلاس کونسل" کی درخواست پر بادشاہ نامنظور کر سکتا تھا اس اہم شرط کے ساتھ کہ بعض مخصوص مسودے مقامی و مرکزی مجالس میں گورنر جنرل کی اجازت لینے کے بعد ہی پیش کئے جاسکتے ہیں مجالس مقننہ کو ہر ممکن آزادی دی گئی تھی چنانچہ

مقامی و مرکزی مجالس ایک دوسرے کے متوازی اپنے فرائض انجام دے سکتی تھیں۔ ان مجالس کا کام صرف قانون سازی ہی تک سختی سے محدود تھا۔ ۱۸۵۳ء کے قانون کے ذریعہ جو اولین مجلس مقننہ ہند قائم ہوئی تھی "اس نے اپنے کو پارلیمنٹ کے نمونہ پر بنا لیا تھا، اور حکومت عاملہ کے کاموں کے متعلق سوال اور ان کے وجوب و مناسبت پر بحث کر کے اس عہد کے خیال کے مطابق تکلیف دہ حد تک کی آزادی کا ثبوت دیا تھا"[1] وزیر ہند سر چارلس ووڈ نے دارالعوام میں ۱۸۶۱ء کی تجاویز پیش کرتے ہوئے دوران تقریر میں اعلان کیا تھا کہ "حکومت ہرگز ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی جس سے کونسل ایک مجلس مباحثہ بن جائے"۔

۱۸۶۱ء کے قانون کے ذریعہ گورنر جنرل کو فوری ضرورت کے لئے یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ایسے وقتی ضوابط بنا سکتا ہے جو چھ مہینے سے زیادہ عرصہ تک نافذ نہ رہ سکیں گے۔ ۱۸۷۰ء کے قانون کے ذریعہ گورنر جنرل کونسل کو یہ حق دیا گیا کہ وزیر ہند "با جلاس کونسل" ان علاقوں کے لئے قواعد منضبط کر سکتا ہے جن کی فہرست بطور ضمیمہ کے دی ہوئی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا مسودہ متعلقہ مقامی حکومت نے تیار کیا ہو۔ یہ قوانین ۱۸۶۱ء کے قانون کے ضمیمے کہے جا سکتے ہیں۔

۱۸۹۲ء کا قانون ہند اہم تبدیلیوں کے ظہور کا باعث ہوا۔ اس کے بموجب گورنر جنرل کی مجلس مقننہ مندرجہ ذیل طریقہ سے مرتب کی گئی:۔

گورنر جنرل

مجلس عاملانہ کے ۶ (یا ۷) ارکان

۶ نامزد شدہ زائد سرکاری ارکان مع بنگال لفٹنٹ گورنر کے باعتبار عہدہ

۶ نامزد شدہ زائد غیر سرکاری ارکان

۵ غیر سرکاری زائد ارکان جن کی نامزدگی کے لئے سفارش کی جاتی

---

[1] منقول از البرٹ صفحہ ۱۰۱

ان میں کے چار ارکان میں سے ایک ایک کو چاروں مقامی مجالس مقننہ کے غیر سرکاری ارکان منتخب کرتے اور ایک کو ایوان تجارت کلکتہ منتخب کرتا۔ مجالس میں غیر سرکاری عنصر بڑھایا ہی نہیں گیا، بلکہ بالواسطہ طرز سے ڈرتے ڈرتے اس کو انتخابی بنیاد پر قائم کر دیا گیا۔ اس قانون کے ذریعے سے مجالس کے حقوق بھی وسیع ہو گئے اور صرف قانون سازی کے کاموں کے علاوہ موازنہ یعنی سالانہ آمد و خرچ کے بیان پر بحث کرنے اور ارکان مجلس عاملہ سے سوالات پوچھنے کے بھی حقوق دیئے گئے۔ صوبوں کی مجالس مقننہ کی ترتیب، اور کاموں میں بھی اسی طرح کی تبدیلیاں کی گئیں۔[1]

ان اصلاحات کو لارڈ ڈفرن نے جاری کیا تھا اور اپنے عہد وائسرائلٹی کے خاتمہ کے قریب انھوں نے اپنی مجلس وزارت کی ایک ذمہ دار کمیٹی تمام مسائل پر غور کرنے کے لئے مقرر کی لیکن قبل اس کے کہ یہ کمیٹی اصلاحات کی تجاویز پیش کرے لارڈ ڈفرن ہندوستان سے چلے گئے۔[1]

برطانوی ہند میں نیابتی ادارات کی ایک اور منزل ۱۹۰۹ء میں طے ہوتی ہے۔ ان وسیع اصلاحات کی ترویج کا سہرا اس وقت کے وزیر ہند لارڈ مارلے آف بلیک برن کے سر رہتا ہے۔ یہ اس لبرل جماعت کے رکن تھے جو دسمبر ۱۹۰۵ء میں برسر حکومت ہوئی ۔ قانون مجالس ہند، جسے ۲۵ مئی ۱۹۰۹ء کو شاہی منظوری حاصل ہوئی تین سال کے مباحثہ و مراسلت کا نتیجہ تھا۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے ہر طبقہ اور تمام مقامی حکومتوں کے خیالات بھی معلوم کر لئے گئے تھے۔[2] ابتداءً یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ حکومت عاملہ اور ہندوستانی معاشرے کے ذمہ دار عنصر کو قریب تر بنانے کے لئے مرکزی و مقامی حکومتوں کے ساتھ صرف مشورہ کے لئے مجالس شرفا بڑھا دی جائیں لیکن بعد میں یہ خیال ترک کر دیا گیا اور اس کے عوض موجودہ مجالس مقننہ کی دوبارہ ترتیب اور ان کے

---

[1] منقول از جائنٹ رپورٹ مسٹر مانٹیگو و لارڈ چیمسفورڈ، پارہ (۶۶ تا ۶۸)

[2] منقول از البرٹ صفحہ ۱۰۸-۱۱۰

اختیارات کی وسعت کے خاکہ کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ مجالس کا انتخابی عنصر ایک بڑی حد تک بڑھا دیا گیا اور صریح الفاظ میں اس اصول کو تسلیم بھی کیا گیا۔ نومبر ۱۹۰۹ء کے قواعد کے ماتحت جو اصل قانون کی شکل میں شائع ہوئے مجلس مقننہ ہند (گورنر جنرل) اس طرح مرتب کی گئی:-

گورنر جنرل

مجلس عاملانہ کے ۷ ارکان

۳۷ سرکاری حکام:
۲۸ زائد ارکان، یہ نامزد شدہ حکام ہوتے تھے، ان میں سے
نو، نو صوبوں کی مقامی حکومتوں کی طرف سے نمائندگی کرتے تھے (نمبر صوبہ دہلی کا چیف کمشنر یا پنجاب کا لفٹنٹ گورنر باعتبار عہدہ شریک ہوتا تھا)

۵ زائد ارکان جو غیر سرکاری نامزد شدہ اشخاص ہوتے تھے۔

۳۲ غیر سرکاری:
۲۷ زائد ارکان غیر سرکاری منتخب شدہ اصحاب ہوتے۔

اس طرح ارکان کی مجموعی تعداد ۶۹ ہوتی۔

مجلس مقننہ ہند کے لئے جن لوگوں کو رائے دینے کا حق تھا وہ مفصلہ ذیل ہے:

(الف) صوبوں کی مجالس مقننہ کے غیر سرکاری ارکان سب ملا کر ۱۳ ارکان منتخب کرتے،

(ب) چھ صوبوں کے بڑے زمیندار اپنے اپنے صوبوں سے ایک ایک،

(ج) چھ صوبوں کے مسلم حیثیت کے مسلمان اپنے اپنے صوبہ سے ایک ایک،

(د) یوروپی ایوان ہائے تجارت کلکتہ و بمبئی ایک ایک۔

صوبوں کی مجالس مقننہ اس نئے طرز پر دوبارہ مرتب کی گئیں اور ۱۹۱۲ء میں دو چھوٹے صوبوں یعنی آسام اور صوبجات متوسط میں بھی مجالس مقننہ قائم کی گئیں۔ ان مجالس کے ارکان کی مجموعی تعداد بڑے صوبوں میں ۴۵ سے ۵۴ تک اور چھوٹے یا کم ترقی یافتہ صوبوں میں ۲۶ سے ۲۷ تک ہوتی تھی۔[1] اس خیال سے کہ ضروری سرکاری تجاویز باسانی منظور ہو سکیں، مجلس مقننہ ہند میں عمداً سرکاری اکثریت

[1] مجلس مقننہ برہما (جو ۱۸۹۷ء میں اولین مرتبہ قائم کی گئی تھی) کے ارکان کی مجموعی تعداد ۱۸ تھی، اور ۱۲ میں منتخب ارکان بالکل نہ تھے

قائم رکھنے کا بندوبست کر لیا گیا تھا۔ لارڈ مارلے نے یہ لکھ دیا تھا کہ گورنر جنرل کی کونسل کا اپنے قانون سازی اور عاملانہ کاموں کے لئے اس طرح بنائی جائے کہ اس پر حضور ملک معظم کی حکومت اور شاہی پارلیمنٹ کی جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور ہمیشہ عائد ہوتی رہیں گی ان کی ادائی میں کسی قسم کی کوئی مزاحمت یا مداخلت نہ ہو، صوبوں کی مجالس مقننہ کے لئے اس قسم کی حفاظت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ برہما کے علاوہ تمام صوبوں میں غیر سرکاری ارکان جن میں منتخب و نامزد کردہ دونوں شامل تھے قلیل اکثریت میں تھے، البتہ صرف بنگال میں ان کی اکثریت تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر صوبے کی جماعت مقننہ میں سرکاری فریق کا اتنا اثر تھا کہ وہ آسانی سے اراکین کی زیادہ تعداد کی رائیں حاصل کر سکتا تھا

مجلس مقننۂ بنگال جس کے ذریعہ ہم دوسرے صوبوں کی مجالس کی عام ترتیب بھی سمجھ سکتے ہیں اس طرح مرکب تھی:-

۲۰ تا ۲۲ سرکاری
- گورنر مجلس عاملانہ کے تین ارکان۔
- ۱۸-۱۶، زائد ارکان جو نامزد شدہ سرکاری حکام ہوتے تھے۔

۳۲ تا ۳۴
- ۴-۶ زائد ارکان جو نامزد شدہ غیر سرکاری اشخاص ہوتے تھے۔
- ۲۸ زائد غیر سرکاری ارکان جو حسب ذیل طرز سے منتخب کئے جاتے،

۱۳-۱۴ بعض مقامی مجالس کے منتخب شدہ ارکان کی طرف سے،

۴-۵ صوبہ کے بڑے زمینداروں کی طرف سے،

۵۔ صوبہ کے معزز مسلم شرفا کی طرف سے،

۴۔ ایوان ہائے تجارت کی طرف سے،

۱۔ جامعہ کلکتہ کی طرف سے،

کل میزان ارکان ۵۴۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اگرچہ مرکزی و صوبہ داری مجالس میں معقول انتخابی عنصر بڑھا دیا گیا تھا لیکن (مسلمانوں کے سوا) عام نمائندگی کے نظام کی ترویج کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی خاص خاص مفاد کی نمائندگی کرنے والوں کے حلقہائے انتخاب بنا دیئے گئے تھے، لیکن ان کے علاوہ ہر جگہ بالواسطہ

انتخاب کا طریقہ رائج کیا گیا تھا یعنی مجالس بلدیہ و مجالس اضلاع کو صوبوں کی مجالس کے ارکان کا انتخاب کرنے کا حق اور مجالس صوبہ کے ارکان کو مرکزی مجلس مقننہ کے اراکین کے انتخاب کا حق دے دیا گیا۔ لوجوہات بالاہم یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۰۹ء کے اصلاحات کے بعد ہندوستان کی کونسلوں میں محض جزوی طور پر نمائندہ عنصر شامل تھا۔

مسلمانوں کی مخصوص حیثیت کی وجہ سے بہت کچھ قابل غور و بحث مسائل پیدا ہو گئے۔ ایک طرف تو لارڈ مارلے جداگانہ انتخاب کے اصول ہی کی تائید کے لئے آمادہ نہ تھے اس لئے کہ ان کے نزدیک اس کا لازمی نتیجہ ہندو و مسلم دونوں فرقوں کی کشیدگی اور اختلاف ہوگا دوسری جانب جدید مجالس مقننہ میں قلیل التعداد مسلمانوں کی مناسب نمائندگی کا مسئلہ بھی اٹل تھا اور مسلم رہنما جداگانہ انتخاب پر اڑے ہوئے تھے یہ اصول تسلیم کر لیا گیا اور ہمارے نزدیک ایک ایسا فیصلہ کیا گیا جو ہندوستان کی نمائندہ مجالس کے مستقبل کے لئے نہایت ہی قابل لحاظ اور اہم تھا۔

۱۹۰۹ء کی مجالس کے کاموں کی طرف غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اختیارات مندرجہ ذیل جانب وسیع کئے گئے تھے۔ قانون ۱۸۹۲ء میں صرف سالانہ موازنہ پر بحث کرنے کی اجازت تھی لارڈ مارلے کے قانون نے یہ اجازت دے دی کہ اس موازنہ کی آخری ترتیب سے پہلے اس میں ترمیمیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں اور ان ترمیموں پر مجلس کی رائے لینے کی بھی اجازت دی گئی۔ ۱۸۹۲ء کے قانون کے بموجب صرف ایسے سوالات پوچھنے کی اجازت تھی جن کی باضابطہ اطلاع دی جا چکی ہو، لارڈ مارلے کے قانون اور اس کے تحتی قواعد سے یہ بھی اجازت مل گئی کہ ایک رکن اپنے اصلی سوال کے سلسلہ میں ضمنی سوالات بھی کر سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اختیار ایک اہم اختیار تھا۔ سب سے بڑھکر اس قانون نے غیر سرکاری ارکان کو یہ اہم حق دیا کہ وہ مفید عام تجاویز پیش کر سکتے اور ان پر مجلس میں رائے لی جا سکتی ہیں۔

مجالس کے انتظامی کاموں کو بھی اسی طرز پر وسیع کرنے کی کوشش

نمایاں طور سے کامیاب نہیں ہوئی اور جیسا کہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے اختیارات قانون سازی کے ساتھ (جو حقیقی تھے) انتظامی اختیارات کو (جو برائے نام تھے) ملانے کی کوشش ایک غلطی تھی۔ کیونکہ کوئی تجویز بھی خواہ اسے مجلس نے منظور ہی کیوں نہ کر لیا ہو حکومت سے سفارش کے سوا کچھ نہ تھی اگر حکومت نے پسند کر لیا تو اسے منظور کر لیا جاتا تھا اور اگر حکومت نے اس کی مخالفت کی اور رائے لینے کا مطالبہ کیا گیا تو سرکاری جماعت اپنی رائے ووٹ سے اسے متاثر کر سکتی تھی۔[1] اس سرکاری جماعت کی موجودگی ابتدا ہی سے مجلس کی تمام مباحث پر ایک غیر حقیقی رنگ چڑھا دیتی تھی اور وہ صریحاً بے حقیقت نظر آتے تھے۔ ابتدا ہی سے حکومت و مجلس کے اختلافات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ ایک طرف تو حکومت ان مسلسل سخت تنقیدات کے لیے جو مجالس کے غیر سرکاری عنصر کی جانب سے اس پر کی جاتی تھیں بے بس تھی اور دوسری جانب مجالس انتظام ملکی پر کوئی موثر نگرانی رکھنے کے اختیارات سے لاچار تھیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تخیل کسی کے سامنے نہیں آیا تھا کہ اصلاح شدہ مجالس اس قسم کے اختیارات بھی استعمال کریں گی لارڈ مارلے تو اس مسئلہ پر بہت سخت تھے ان کی رائے تھی کہ "اگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس باب اصلاحات نے ہندوستان میں بلاواسطہ یا بالواسطہ پارلیمنٹ کے نظام حکومت کو ہندوستان میں قائم کیا ہے، تو مجھے ان اصلاحات سے کوئی بھی تعلق نہ ہوگا۔" تاہم یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ یہ اصلاح شدہ مجالس جو ملکی انتظام پر موثر نگرانی کرنے سے عاجز تھیں، کس طرح اپنی مشیرانہ حیثیت کو بھی قائم رکھتی تھیں۔ ان مجالس کے فرائض کے تخیل ہی میں اس تضاد کے نشانات موجود ہیں۔ سنجیدہ، ہمیدہ، تعمیری مشورہ عموماً صرف وہی اشخاص دے سکتے ہیں، جو ان مشوروں کو ماننے اور ان پر عمل کرنے سے جو نتائج پیدا ہوں ان کے لیے کچھ نہ کچھ ذمہ دار ہوں، ورنہ ایک غیر ذمہ دار ناقد کا مشورہ یقیناً بالکل مختلف قسم کا ہوگا۔ ایک ایسا مشورہ جو احساس ذمہ داری سے آزاد ہو، عموماً اس سے ناقد کا مقصد معاونت و مشارکت کی بجائے انتشار

---

[1] مجلس بنگال میں ایک یا دو مثالیں ایسی ہیں جن میں حکومت کے خلاف کوئی بات منظور ہوئی لیکن ایسا شاذ کالمعدوم ہے۔

پیدا کرنا اور عیب جوئی ہوتا ہے اور ان اصلاح شدہ مجالس میں جو تجاویز پیش ہوئیں یا جو مباحث ہوئے ان سے اسی کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ سچ پوچھئے تو گذشتہ واقعات کو دیکھتے ہوئے اس نتیجہ پر آنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ مجالس کے انتظامی امور کی وسعت کا تخیل ہی بالکل غلط تھا اور ہم دیکھیں گے کہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کی دوسری یعنی موجودہ منزل ہی میں ایک نئی ہی صورت اختیار کرنی پڑی اور مجالس کو اسی بنیاد پر جسے لارڈ مارلے نے مسترد کر دیا تھا بنانا پڑا یعنی وہ اصول جن پر تمام پارلیمنٹی مجالس کی بنیاد قائم ہے۔

بہرکیف جب سب کچھ کہا جا چکا تو یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ جدید مجالس نے اپنے دہ سالہ وجود میں ہندوستانی سیاسی رہنماؤں اور برطانوی حاکموں دونوں کے لئے قوانین پارلیمنٹ اور نقطۂ نگاہ پارلیمنٹ کے قائم کرنے میں بیش قیمت میدان تربیت کا کام دیا ہے اور اگر تمام دوسری باتوں کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان مجالس نے ایک نہایت وقیع اور قابل قدر فرض ادا کیا۔

اس موقع پر ہم کو مرکزی مجلس عاملہ کی چند دستوری تبدیلیوں پر بھی نظر ڈال لینی چاہئے۔ ۱۸۶۱ء میں گورنر جنرل کی مجلس عاملہ یا وزارت میں ایک پانچویں رکن کا اضافہ ہوا اور ۱۸۷۴ء میں اس تعداد کو چھ تک بڑھانے کا اختیار دیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں محکمہ تعلیمات ایک مستقل محکمہ ہو گیا اور چھٹا رکن اس طرح مستقل بن گیا (ان کے علاوہ سپہ سالار ہمیشہ اس مجلس میں ایک غیر معمولی رکن کی حیثیت سے شریک رہا) چھ معمولی ارکان میں سے تین ہندوستان کی سول سروس) کے ارکان ہونے اور ایک (رکن قانونی) پانچ سال کام کیا ہوا بیرسٹر یا اڈووکیٹ ہونا لازم تھا۔ وائسرائے کی مجلس کابینہ میں سب سے پہلے لارڈ مارلے کے اشارے سے مسٹر سنہا (بعد میں لارڈ سنہا اور بہار و اڑیسہ کے اولین گورنر مقرر ہوئے) اس سال کی اصلاحات کے رائج ہونے سے کچھ ہی قبل مارچ ۱۹۰۹ء میں رکن قانون مقرر کئے گئے اور اس وقت سے برابر ایک ہندوستانی رکن

ہوتا آتا ہے۔[1]

۱۹۰۹ء کے قانون مجالس ہند نے، بمبئی اور مدراس کے گورنروں کی مجلس عاملہ کے ارکان کی تعداد زائد از زائد چار تک بڑھا دینے کا اختیار دیا، ان میں سے دو سول سروس کے رکن ہونے لازم تھے۔ اسی سال ایک ہندوستانی باقی ماندہ جگہ پر مقرر کیا گیا اور اسی وقت سے ہر اس صوبہ میں جہاں ایک مجلس عاملہ ہے یہی دستور جاری ہے۔ اسی قانون کے ذریعہ بنگال میں ایک مجلس عاملہ کے قیام کا اور اس کے بعد پارلیمنٹ کے ہر دو ایوان کی منظوری سے ہر دوسرے صوبہ میں اسی قسم کی مجلس عاملہ کے قائم کرنے کا حق ملا۔ اگلے ہی سال بنگال میں ایک مجلس عاملہ قائم کی گئی ۱۹۱۲ء میں دور رس نتیجہ خیز انتظامی تبدیلیاں عمل میں آئیں، یعنی ہندوستان کا دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گیا، اس کے ساتھ ہی ۱۹۰۵ء میں اس تقسیم کو منسوخ کر کے جو لارڈ کرزن نے بنگال بہار اور اڑیسہ کی کی تھی ایک نئی تقسیم عمل میں آئی لارڈ کرزن نے مشرقی بنگال و آسام کو ایک لفٹنٹ گورنر کے ماتحت ایک مستقل صوبہ بنایا تھا، اب بنگال کا یہ حصہ بقیہ بنگال سے ملا دیا گیا اور اس جدید صوبہ پر ایک گورنر کا تقرر کیا گیا۔ آسام ایک مرتبہ پھر ایک چیف کمشنر کے ماتحت آ گیا اور بہار و اڑیسہ ایک لفٹنٹ گورنر کے ماتحت کر دیا گیا اور قرار پایا کہ اس میں ایک مجلس عاملہ کا بھی تقرر ہو گا۔ ۱۹۱۵ء میں صوبہ متحدہ کے لئے ایک مجلس عاملہ کی تجویز کو دارالامراء نے مسترد کر دیا تھا کیونکہ اس وقت جس جماعت کو قوت حاصل تھی وہ انتظامی تکمیل کے لئے واحد مستبدانہ قوت عاملانہ کو بہتر سمجھتی تھی۔

اب اس حکومت کی دستوری ترقی کا خاکہ پیش کرنا باقی رہ گیا ہے "جو حکومت وطن" کہلاتی ہے لارڈ نارتھ کے ۱۷۷۳ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ نے تمام اختیارات مجلس نظما کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے یہ ۲۴ نفوس

---

[1] موجودہ اصلاحات کے ماتحت یہ تعداد تین تک بڑھا دی گئی ہے۔

کی اس جماعت کو "مجلس مالکان" جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام بڑے بڑے شرکا شریک ہوتے تھے منتخب کرتی تھی اور ایک بڑی حد تک ان کی کارروائی کی رہنمائی بھی کرتی تھی لیکن پٹ کے قانون ۱۷۸۴ء کے ذریعہ بہت سی اہم تبدیلیاں عمل میں آئیں جو اختیارات کہ مجلس مالکان کو مجلس نظماء کے متعلق تھے وہ اب مجلس نگران کو دے دیئے گئے جو پارلیمنٹ کی نمائندہ تھی اس مجلس کو مجلس نظماء کے تمام کاغذات و مراسلات تک دسترس تھی وہ اس مجلس کی ہر کارروائی میں ترمیم یا تنسیخ کر سکتی تھی اور اپنی مجلس یا اس کی کسی منتخب جماعت کے ذریعہ بلاواسطہ احکام صادر کر سکتی تھی یہ مجلس جو "مامورین معاملات ہند" کے نام سے موسوم تھی ایک صدر اور پریوی کونسل کے پانچ ارکان پر مشتمل ہوتی عملاً اس صدر کو وہ سب اختیارات حاصل تھے جو تمام مجلس کو دیئے گئے تھے اور مجلس کا صرف نام ہی نام باقی تھا۔

اس طرح وہ مشہور دوعملی حکومت قائم ہوئی جو ۱۸۵۸ء تک نافذ رہی ۱۸۵۳ء کے قانون منشور نے شاہی اختیارات کو مستحکم کیا مجلس نظماء کے ارکان کی تعداد ۲۴ سے گھٹا کر ۱۸ کر دی گئی اور جن میں سے ⅓ بادشاہ کے نامزد کردہ ہوتے ۱۸۵۸ء میں جب ہندوستان بلاواسطہ تاج کے ماتحت چلا گیا تو اس وقت موجودہ اصول پر حکومت انگلستان مرتب کی گئی مجلس نگران کے صدر کی جگہ وزیر ہند نے لی اور پندرہ ارکان کی ایک مجلس جس کے سات ارکان کو پہلی دفعہ مجلس نظماء نے خود منتخب کیا تھا خود اس کی جگہ مقرر کر دی گئی۔

آج کل وزیر ہند اس بات پر مجبور ہے کہ ہندوستان کے لئے جو تقررات ہوں یا ان اخراجات کے متعلق جو ہندوستانی آمدنی سے ہوں، اپنی مجلس کی اکثریت کی رائے پر عمل کرے اس طرح نظری حیثیت

سلہ ایسٹ انڈیا کمپنی باضابطہ طور پر پہلی جون ۱۸۷۴ء کو توڑ دی گئی۔

سے ہندوستان کے متعلق پارلیمنٹ کے وہ حقوق جو اسے ہندوستان کے متعلق حاصل ہیں اور جنھیں وہ وزیر ہند کے ذریعہ استعمال کرتی ہے، محدود ہیں لیکن عملاً اس کے اختیارات پر کسی نے اس وقت تک اعتراض نہیں کیا ہے۔ باقی تمام معاملات میں مجلس وزیر ہند کی حیثیت ایک جماعت شوریٰ کی سی ہے لیکن اگر وزیر ہند اس کا کوئی مشورہ مسترد کردے تو اسے اس کے اسباب قلمبند کرنے پڑیں گے مجلس وزیر ہند کا نقشہ وقتاً فوقتاً بدلتا رہا ہے ۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند کی اہم تبدیلیوں سے پہلے یہ مجلس کم از کم دس اور زائد از زائد ۱۴ ارکان پر مشتمل ہوتی جو عموماً سات سال تک اپنے عہدہ پر بحال رہتے اور ان میں سے ۹ کے لئے ضروری ہوتا کہ انھوں نے قریبی زمانہ میں ہندوستان[ل] میں کم از کم دس سال تک ملازمت یا اقامت اختیار کی ہو۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مطالبہ پر کوئی رکن برطرف کیا جاسکتا ہے۔ مجلس وزیر ہند کا کوئی رکن پارلیمنٹ میں رکن کی حیثیت سے شریک نہیں ہوسکتا۔ ۱۹۰۷ء سے ہندوستانیوں کو عموماً اس مجلس میں جگہ ملتی ہے، لیکن حال کے زمانے میں ہندوستانی اراکین کی تعداد تین کردی گئی ہے۔

ل بلکہ ۱۹۱۹ء کے قانون سے پہلے برطانوی ہند میں۔

باب (۳)

فضائے اصلاحات (سنہ ۱۹۱۴-۱۹ء)

سنہ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات مارلے منٹو جن کا گزشتہ باب میں اجمالی تذکرہ کیا جاچکا ہے اور جن سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں بہت ہی تھوڑے تجربہ کے بعد سخت مایوس کن ثابت ہوئیں۔ برطانوی حکام کو امید تھی کہ اصلاح شدہ مجالس، ایسی مجالس شوریٰ ہونگی جو ہندوستان کی قومی زندگی کے نسبتہً قدامت پسند عنصر سے مرکب ہونگی اور وہ ہر وقت حکومت کی امداد کے لئے تیار رہینگی۔ ان کی نصائح مفید ہونگی اور ان کی تائید حکومت کے ہاتھوں کو مضبوط کریگی۔[۱] اس میں ان کو مایوسی ہوئی۔ دوسری طرف ہندوستانی مدبرین کا خواہ وہ اعتدال پسند ہوں یا انتہا، خیال تھا کہ وہ ان مجالس کے ذریعہ کچھ نہیں تو بالواسطہ ہی سہی، ملکی انتظامات کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھ سکیں گے لیکن ان کو بھی مایوسی ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۹ء کی مجالس، محض مجالس شوریٰ کی حیثیت سے بنائی گئی تھیں اور اس حیثیت سے وہ بہت مفید ثابت ہوئیں لیکن ہندوستانیوں نے اسے

---

[۱] جائنٹ رپورٹ پارہ ۔ ۷۳ ۔

مجالس پارلیمنٹ کی حیثیت سے دیکھا۔ ابتدا ہی سے غیر سرکاری ارکان نے اپنے کو ایک جماعت "مخالفین" بنا لیا، ادھر سرکاری ارکان نے ایک مستحکم حکومتی جماعت ترتیب دی۔ مجلس مقننۂ ہند میں مسٹر گوکھلے جن کی اس وقت ہندوستانی سیاسیات میں ایک ممتاز ہستی تھی جماعت مخالفین کے رہنما سمجھے جاتے تھے چونکہ ان مجالس میں کبھی بھی جماعت مخالفین کی تجویز کو غلبہ دینے کا خیال بھی نہیں ہوا تھا، ورنہ پارلیمنٹ کی اصطلاح میں یہ ممکن تھا اس لئے حکومت کی تمام کارروائیوں اور حکمت عملیوں پر جو تنقیدیں ہوتیں وہ دوستانہ حیثیت سے گذر کر غیر ذمہ دارانہ حد تک پہونچ گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کوئی قابل رشک چیز نہ رہی، اور بجائے اُس کے کہ حکومت کو تعمیری مشورہ یا اخلاقی تائید دی جاتی کہ جس کی اسے امید تھی اور جس کی وجہ سے ملکی انتظامات بڑی حد تک مکمل ہو جاتے، اسے صرف مخالفت و مزاحمت ہی نصیب ہوئی۔ اس منظم مخالفت نے ایک طرف تو حکومت کے اختیارات پر اعتراض کر کے اس کی تکمیل کو سخت صدمہ پہونچایا، اور دوسری طرف اپنے نقادوں کو ہموار کرنے کی وجہ سے اس نے حکومت کو مذبذب و نہایت محتاط کر دیا۔[۱]

جنگ نے جو صورت حال پیدا کر دی اور اس نازک وقت میں ہندوستان کو اقوام عالم میں عموماً اور ان اقوام میں جو برطانوی تاج کے زیر سایہ ہیں خصوصاً، جو درجہ حاصل ہو گیا تھا، اس کا میں کسی دوسری جگہ تذکرہ کر چکا ہوں، موجودہ باب میں میں جنگ کے سیاسیات ہند پر جو فوری اثرات ہوئے اور دستوری اصلاح کی تحریک پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ ابتداً ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کا جو غیر امید افزا نتیجہ ہوا اس کو میں بتا چکا ہوں اس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ ان سے جو سیاسی صورت حال پیدا ہو گی وہ ہمارا نقطۂ آغاز ہے، لیکن اس سے زیادہ یہ ہے کہ بہتوں نے اسے دستوری ترقی کے لئے ایک بنیاد قرار دیا اس وقت ہم کو اس مقصد کے لئے ان اصلاحات کی فطری خامی کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

---

[۱] ایضاً پارہ ۱۰۸

مختلف اصلاحی اسکیموں میں[1] اولین وہ تھی جسے آغاز جنگ کے چند ہی ماہ بعد ممتاز ہندوستانی مدبر مسٹر گوکھلے نے بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن کی فرمائش سے تیار کیا تھا۔ مسٹر گوکھلے اپنے پہلے ہی پارہ میں جسے میں نیچے نقل کرتا ہوں نہایت ہی دور اندیشی سے مسئلے کی تہ تک پہونچ گئے تھے۔[2]

"صوبہ کی خود مختارانہ حکومت کی جس کا پتہ مراسلت دہلی ہی سے چلتا ہے منظوری ہندوستانیوں کے لئے جنگ کے خاتمے پر بہترین رعایت ہو سکتی ہے۔ اس میں صوبوں کی حکومتوں کو آزاد کرنے کے لئے دو کارروائیاں کرنی ہونگی، ایک طرف تو ان کو اس نگرانی سے جو حکومت ہند اور وزیر ہند، ملک کے اندرونی انتظام کے متعلق رکھتے ہیں، آزاد کرانا ہوگا، اور دوسری طرف اس کی جگہ صوبوں کی مجالس مقننہ کے ذریعہ محاصل ادا کرنے والوں کے نمائندوں کی نگرانی قائم کرنا پڑیگی۔"

صوبہ کی خود مختاری کا مسٹر گوکھلے نے بہت ہی صحیح مفہوم سمجھا کہ صوبہ داری کا عملہ صوبہ کی مجلس مقننہ کے ماتحت ہو، لیکن انھوں نے یہ نگرانی اس وقت کے طرز حکومت کی بنا پر قائم کرنا چاہی۔ انھوں نے اس میں نہ صرف مجلس مقننہ کو بلکہ صوبہ کی جماعت عاملہ کو بھی ویسا کا ویسا ہی رکھ کر اس پر اپنی تجاویز مبنی کیں۔ بلاشبہ انھوں نے یہ تجویز کی کہ مجلس مقننہ کے ۴/۵ اراکین منتخب ہونگے لیکن ان کا طریق انتخاب ویسا رہے جیسا تھا۔ انھوں نے وسیع حلقہ جات انتخاب کی ضرورت کو نظر انداز کردیا جس کے ذریعے سے جدید مجالس کی تنظیم جمہوری بنیاد پر قائم ہو جاتی۔ ان کی دوسری تجویز یہ تھی کہ مجلس عاملہ وسیع تر کردی جائیگی اور اس کے چھ اراکان میں سے تین ہندوستانی ہی ہوں۔ لیکن

---

[1] مسٹر گوکھلے کی افسوسناک قبل از وقت موت نے ہندوستان کو ان کی خدمات سے ایسے وقت میں جبکہ اسے سب سے زیادہ ان کی ضرورت تھی محروم کردیا۔ وہی ایک ہستی، صحیح ترین فیصلہ و سنجیدہ مشورہ دینے کی اہل تھی۔ ان تجاویز کا مسودہ اگست ۱۹۱۷ء میں شایع کیا گیا۔

[2] مندرجہ صفحہ ۲۸۔

اس کا خیال بھی نہ تھا کہ حکومت کے کس حصے کو مجلس مقننہ کے ماتحت کیا جائے اور بجز اس کے کہ یہ تاج کی مقرر کردہ و ناقابل تبدیل جماعت ہے کوئی دوسرا طرز عمل ان کے گمان میں بھی آنا دشوار تھا۔ مسٹر گوکھلے نے لکھا تھا کہ "مجلس عاملہ انفرادی یا اجتماعی کسی صورت میں بھی اپنے قیام کے لئے اکثریت کی حمایت و تائید پر منحصر نہ ہوگی۔" لیکن ظاہر ہے کہ صوبوں کی صحیح حکومت خود اختیاری کے لئے ضروری ہے کہ مجلس مقننہ کی طرح مجلس عاملہ بھی رائے عامہ کے مطابق ہونے کا ثبوت دے یقیناً مسٹر گوکھلے کو اس بات کا احساس تھا کہ صوبوں کی حکومتوں کو اس طرح ترتیب دینا کہ ان سے ان کے اختیارات کمزور ہو جائیں، یا واقعی حکومت کی باگ ناتجربہ کار ہاتھوں میں دیدینا بہت خطرناک ہوگا، اس لئے انھوں نے اس اصلاح شدہ حکومت پر جو ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کے ذریعہ ہوئی تھیں اپنی تجاویز کی بنیاد رکھی اور ایک غیر سرکاری عنصر کی شمولیت ہی کو کافی سمجھا۔ بہرکیف اس قسم کی حکومت اگرچہ محدود و مطلق العنانی کے لئے موزوں ہوسکتی ہے، لیکن حقیقی جمہوریت کے لئے بالکل ہی ناکافی ہے۔ مسٹر گوکھلے کو خود اس کمزوری کا احساس تھا اور وہ جرمنی کی مثال دے کر اس کی حمایت کرتے تھے انھوں نے لکھا تھا کہ اس طرح جو مجلس مقننہ و مجلس عاملہ بنائی جائینگی ان کے تعلقات عام طور سے وہی ہونا چاہئیں جو جرمنی کی شاہی حکومت اور وہاں کی جماعت مقننہ میں ہیں[1]۔ اس سے زیادہ صحیح تشبیہ اور وہ بھی ایسی جس کے متعلق تجربہ کا فیصلہ متفقہ ہے، ایک اس برطانوی نوآبادی کی ہے، جو ایسی حکومت کے ماتحت ہو جو "نیابتی" حکومت کہلاتی ہے، اور جبکہ ایک مقامی مجلس مقننہ کو مالیات و وضع قوانین کے اختیارات حاصل ہوں

[1] جائنٹ رپورٹ کے مصنفین نہایت ہی سنجیدگی سے لکھتے ہیں (پارہ ۱۶۶) کہ جرمنی میں اس کا مخصوص طرز حکومت صرف اس لئے رہا جس میں ایک منتخب مجلس مقننہ اور ناقابل تبدیلی مجلس عاملانہ ہوتی تھی، ہم کو ممکن نظر آتا ہے کیونکہ جرمن حیات سیاسی کا اساسی اصول سیاسی قابلیت کے بجائے حربی اطاعت ہے نیز مقابلہ کرو، کرٹس: "دوعملی حکومت" (Curtis . Dyarcny) صفحہ ۳۹۔

اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسی جماعت عاملانہ ہو جو تاج کی مقرر کردہ و ناقابل تبدیلی ہو جیسا کہ پریزیڈنٹ لوئل اپنے اس حصہ تحریر میں جسے میں نے اوپر نقل کیا ہے کہتے ہیں[1]، کہ "عوام کی منتخب کردہ مجلس مقننہ کے ساتھ ایک دور و دراز کی حکومت کے مقرر کردہ گورنر کا ملانا، اختلافات کی تخلیق اور انھیں دائمی بنانے کی بہترین ترکیب ہے"۔

البتہ مسٹر گوکھلے نے اس بات کو منظور کر لیا تھا کہ مرکزی حکومت یعنی حکومت ہند کو صوبوں کی حکومتوں کے سلسلہ میں ایسے حقوق دینا ناگزیر ہیں، جن کو وہ ضرورت کے وقت استعمال کر سکے مرکزی مجلس مقننہ میں اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے صوبہ واری مجالس مقننہ کے متعلق خاص اختیارات کے ساتھ ہی ان میں سرکاری (حکومتی) اکثریت کی تجویز کی تھی، چنانچہ انھوں نے لکھا تھا کہ "اگر کسی صوبہ کی مجلس مقننہ کسی ایک ایسے قانون کو جسے حکومت اس صوبہ کی فلاح کے لئے ضروری سمجھتی ہو منظور کرنے سے برابر انکار کرتی رہے تو حکومت ہند حکومت صوبہ کے علی الرغم ایسا قانون منظور کر سکتی ہے" اس کے برعکس انھوں نے ایک نہایت خطرناک آئینی اصول کو رائج کرنا چاہا تھا۔ ان کی تجویز تھی کہ موازنہ سے متعلق تجاویز کی طرح صوبہ کی حکومت سے متعلق جو تجاویز صوبہ کی مجلس مقننہ منظور کرے حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ ان کے مطابق عمل کرے مگر یہ کہ گورنر اسے اپنے مخصوص اختیارات کی بنا پر مسترد کر دے۔ اس قسم کی تجویز کی کوئی مثال نہیں ملتی، حتی کہ ان ممالک میں جہاں کی حکومت کی بنیاد ہی ارکان جماعت مقننہ پر ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ اس کے معنی انتظام حکومت میں مجلس مقننہ کے مداخلت کے ہوتے ہیں اور کوئی بھی خود دار حکومت خواہ اس کی ترتیب کسی طرح کی بھی ہو، اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ خیال بھی ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے پیدا ہوتا ہے ورنہ اس کا نام بھی سننے میں نہ آتا۔ اس اسکیم میں کہ وہ مجلس مقننہ کو ایک

---

[1] جملہ مذکور صفحہ ۴۷ حاشیہ (اشاعت انگریزی)۔

جماعت شوریٰ کی حیثیت سے ایسے اختیارات دے دیئے گئے تھے جن کی بنا پر وہ تجاویز متعلق مفاد عامہ منظور کر سکتی تھی چونکہ غیر سرکاری ارکان ان قراردادوں کے منظور کرانے میں ناکام رہے اور انتظام حکومت میں مداخلت سے محروم پا کر اپنی بے بسی پر پریشان ہونے لگے، اس لئے مسٹر گوکھلے نے مفصلۂ بالا تجویز کی کہ اس طرح مجلس مقننہ کا حکومت عاملہ پر اثر پیدا ہو جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ عمومی اکثریت حاصل کر کے اس کی تجاویز کو لازمی قرار دیا جائے۔

باعتبار تاریخ گوکھلے کی تجاویز کے بعد دوسری قابل ذکر اصلاحی تجویز وہ تھی جو آخر ۱۹۱۵ء میں سر ولیم ڈیوک نے پیش کی تھی۔ پہلے وہ بنگال کے لفٹنٹ گورنر تھے، لیکن ۱۹۱۵ء میں وہ مجلس وزیر ہند کے ایک رکن تھے۔ سر ولیم ڈیوک کی یہ تجویز اصلاحات "یادداشت ڈیوک" کے نام سے موسوم ہوئی۔ انھوں نے یہ یادداشت انجمن "راونڈ ٹیبل" گول میز کے بانی مسٹر لائونل کرٹس کے مشورہ سے تیار کی تھی۔ مسٹر کرٹس نے اپنی یہ انجمن ۱۹۱۰ء میں قائم کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت برطانیہ کے مختلف ممالک میں اتحاد پیدا کیا جائے، اور اس کی صورت یہ تھی کہ منتظم طریقہ سے تبادلۂ خیالات ہو، اس مقصد کے حصول کے لئے تمام نوآبادیات اور ہندوستان میں مجالس قائم کی جائیں اور ایک سہ ماہی رسالہ شایع کیا جائے جو معاملات سلطنت برطانیہ پر بحث کرے۔ مسٹر کرٹس نے اپنی اس وقت کی تصنیف "دو عملی حکومت" (Dyarchy) میں آئینی ہندوستان کے مسئلہ کے متعلق اس یادداشت کی اہمیت پر بحث کی تھی، اور بتایا تھا کہ کس طرح انھوں نے اور ان کے احباب نے جدید حالات کے مطابق اس کو مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں جہاں دوسرے کاغذات جمع کئے تھے وہیں اس یادداشت کو بھی شامل کر لیا تھا اور اس کی سرخی یہ تھی "حکومت بنگال میں اصول دو عملی کے انطباق کا تجربہ"۔

یہ سرخی اس یادداشت کے مضمون کی اصلی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے مصنف نے جس خیال کو پیش کیا ہے اس کو مندرجۂ ذیل دو اقتباسات کے ذریعہ

بہتر طریقہ سے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ پہلا اقتباس مسٹر گوکھلے کی تجاویز پر اظہار رائے ہے اور دوسرا ان تبدیلیوں کو ظاہر کرتا ہے جو ۱۹۲۱ء میں حقیقۃً عمل میں آئیں۔ مسٹر کرٹس بالکل درست کہتے ہیں کہ "یادداشت ڈیوک پہلی تحریر ہے جس میں موجودہ آئین کو ایک حقیقی شکل و صورت دی گئی ہے[1]"۔

"یہ بہتر ہوگا کہ ہم سب سے پہلے اس بات پر غور کریں کہ موجودہ حکومت کے عام خاکہ میں کس قسم کی تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ ظاہراً اس موجودہ خاکہ میں تبدیلی کی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں ہے کیونکہ معمولی سی تبدیلی سے بھی حکومت صوبہ کے حقیقی اختیارات گورنر اور اس کے مستقل ماتحتوں کے قبضے سے نکل کر مجلس مقننہ کی منتخب اکثریت کے ہاتھ میں چلے جائیں گے اور یہ ہر معنی کر کے ایک انقلاب کے مترادف ہوگا"۔

"تو پھر دوسری صورت یہی ہے کہ جہاں کہیں بغیر کسی نقصان کے ممکن ہو (حکومت صوبہ) کے بعض شعبہ جات حکومت کے متعلق مجالس صوبہ کو محض نیابتی حیثیت سے نکال کر فوراً ذمہ دارانہ حیثیت دے دی جائے، اور باقی محکمے علیٰ حالہ موجودہ طریقہ پر رہیں، اور گورنر کی ذات میں ایک طرف تو ایک دستوری حاکم اور دوسری طرف حقیقی عامل کے اختیارات جمع کر دیئے جائیں۔۔۔۔ تجویز یہ ہے کہ منتقل شدہ شعبوں میں (صوبہ کی) مجلس مقننہ کو کامل حقوق حاصل ہوں اور ان کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو انہی میں سے ہوں اور انہی کے جواب دہ ہوں"۔

لارڈ چمسفورڈ نے جو اپریل ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ کی جگہ ہندوستان کے وائسرائے ہوئے تھے، جب یہ جاننا چاہا کہ گول میزی جماعت کن نتائج پر پہنچی ہے تو مئی میں ان کے پاس اس "یادداشت ڈیوک" کی ایک نقل بھیجدی گئی۔ ہمکو بتایا گیا ہے[2] کہ لارڈ چمسفورڈ نے ہندوستان

---

[1] ڈیارکی صفحہ (۲۷)۔
[2] ڈیارکی صفحہ (۲۶)۔

جانے سے پہلے ہی اپنی یہ رائے قائم کر لی تھی کہ برطانوی سوراجی قلمروؤں کی سی ذمہ دارانہ حکومت ہی ہندوستان کی دستوری ترقی کی غایت ہو سکتی ہے اور اس کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ اس میں کچھ بھی شک نہیں ہو سکتا کہ یادداشت ڈیوک نے ان کی اس رائے کو مزید تقویت پہنچائی اور اس سے معلوم ہو گیا کہ عملی انتظامات کے نقطۂ نظر سے اس مقصد کے حصول کے لئے کس قسم کی تبدیلی ممکن ہے، کیونکہ اس یادداشت کو سر ولیم ڈیوک جیسی مستند ہستی کی سند حاصل تھی۔ ۱۹۱۷ء کی خزاں میں جب حکومت کی حکمت عملی کا باضابطہ اعلان کیا گیا اور مسٹر مانٹیگیو کی آمد ہند کی خبر مشتہر کی گئی تو حکومت ہند نے صوبوں کی حکومتوں سے ان کی ابتدائی رائیں طلب کیں، اور ان کے پاس جو گشتی مراسلے روانہ کئے گئے ان میں دوسرے کاغذات کے ساتھ یہ یادداشت ڈیوک بھی تھی۔

دوسری قابل ذکر تجویز وہ ہے جو "انیس کی یادداشت" کے نام سے موسوم ہے، یہ وہ یادداشت ہے جسے ستمبر ۱۹۱۶ء میں مجلس مقننہ ہند کے ۱۹ غیر سرکاری ارکان نے وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ حقیقتہً یہ ہندوستان کے بہترین سیاسی رہبروں کا ایک اعلان تھا اور ایسے نازک وقت میں اس کے اعلان کا محرک و معاون یہ علم ہوا ہو گا کہ پس پردہ ایک سرکاری اسکیم زیر ترتیب ہے۔ اس یادداشت میں لکھا تھا کہ "ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حکومت صورت حال سے آگاہ ہے، اور وہ ملک کے نظام سیاسی کی تبدیلی پر غور کر رہی ہے، اس لئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم کو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر حکومت کو بتانا چاہیئے کہ اصلاحات کی کیا شکل ہونی چاہیئے"۔ اسی زمانے میں پہلی ہوم رول لیگ مدراس میں قائم کی گئی۔ اس کی روح رواں مسز اینی بسنٹ تھیں[۱]۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے اپنے اجلاس لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ جو اسی قسم کی ایک مجلس ہے

---

[۱] مسز اینی بسنٹ ۱۹۱۷ء کی کلکتہ کی انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدر منتخب ہوئیں۔

ایک متحدہ اسکیم منظور کی۔ یہ اسکیم "انیس[19] کی یادداشت" پر بہت کچھ مبنی تھی اور یہ "کانگریس لیگ اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔

ایک حیثیت سے "کانگریس لیگ اسکیم" مسٹر گوکھلے کی تجاویز سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس تجویز کو پیش کر کے کہ اصلاح شدہ مجالس مقننہ کے ارکان "حق رائے دہی کو حتی الامکان وسیع کر کے بلا واسطہ قوم کے منتخب شدہ اشخاص ہوں"، اس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ مجلس مقننہ کے لئے جیسے پارلیمنٹی حقوق میں کامل عمومی بنیاد ہونا چاہئے۔ دوسری حیثیتوں سے کانگریس لیگ اسکیم نے ان نقائص میں اور بھی زیادہ مبالغہ آمیزی کی کیفیت پیدا کر دی جو پارلیمنٹی حکومت کا ایک ایسے سیاسی نظام پر اضافہ کرنے سے ہونا لازمی ہے جو اس سے بقول لارڈ مارلے کے بالکل مغایر و مختلف ہو۔

مسٹر گوکھلے کی تجویز تھی کہ مجلس مقننہ کی تجاویز کی تعمیل جماعت عاملہ کے لئے ضروری ہو لیکن گورنر کو اختیار امتناع حاصل ہو۔ کانگریس اس سے ایک قدم اور آگے بڑھی، اور اس نے کہا کہ مجلس مقننہ اپنی کسی تجویز کو اگر ایک سال بعد پھر منظور کرے تو جماعت عاملہ پر اس کی تعمیل بہرصورت لازمی ہوگی۔ مسٹر گوکھلے کی تجویز پر یہ اعتراض کیا جاسکتا تھا کہ اگر ایک ایسی تجویز کی، جسے حکومت عاملہ بالکل پسند نہ کرتی ہو، مسترد کرنے کی تمامتر ذمہ داری صرف گورنر کے سر پڑتی ہے، لیکن کانگریس کی تجویز اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض ہے اس لئے کہ وہ گورنر ہی کو بالکل بے بس کر دیتی ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مجلس مقننہ کی کسی تجویز کو ایک قانون سے بھی زیادہ وقعت و اہمیت دی جاتی اس لئے کہ قانون سازی میں گورنر بہ تاج کا نمائندہ ہوتا، خود شریک ہوتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس طرح جماعت عاملہ کی حیثیت بالکل باقی نہ رہتی، چنانچہ جائنٹ رپورٹ (متفقہ یادداشت) کے مصنفوں نے کانگریس لیگ اسکیم پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کوئی حکومت بھی اس طرح اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتی کہ وہ ایسے کام کرنے کے لئے

مجبور کی جائے جسے وہ خود ناپسند کرتی ہے۔ ایک ایسی جماعت عاملہ، جس کا بنانا اور بگاڑنا مجلس مقننہ کے ہاتھ میں ہو، ایک چیز ہے، اور ایک ایسی جماعت عاملہ جو قابل تبدیل تو نہ ہو لیکن مجلس مقننہ کے احکام کے مطابق کام کرنے پر مجبور کی جاسکے بالکل ہی دوسری چیز۔

تم کو یاد ہوگا کہ مسٹر گوکھلے نے مجلس مقننہ ہند میں سرکاری اکثریت کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ حکومت ہند کے لئے چند اختیارات محفوظ کرنے کی تجویز کی تھی اور اسے صوبہ واری قانون سازی کے بھی اختیارات صوبہ واری جماعت مقننہ کے متوازی دینا چاہتا تھا۔ کانگریس نے اس قسم کی تمام شرائط کو یک قلم نظر انداز کر دیا۔ کانگریس کا مطالبہ تھا کہ مرکزی مجلس مقننہ میں ۵/۴ منتخب ارکان ہوں، اس طرح اُن کی اکثریت ہو اور اس کے اختیارات تمام ہندوستان کے متعلق امور تک محدود ہوں۔ اس نے مدافعت اور امور خارجیہ کے علاوہ وضع قوانین اور مالیات کے تمام اختیارات مرکزی مجلس مقننہ کو دیدیئے اور انتظام ملکی کے سلسلہ میں اس نے مجلس مقننہ کی تجاویز کی تعمیل نہ صرف حکومت ہند بلکہ صوبوں کی حکومتوں کے لئے بھی لازمی قرار دے دی۔

کانگریس لیگ اسکیم کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ اس کے نزدیک نہ صرف گورنر یا گورنر جنرل کی جماعت عاملہ کے نصف ارکان ہندوستانی ہونے چاہئیں بلکہ ان ارکان کا انتخاب صوبہ داری یا مرکزی مجلس مقننہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے۔ ایک مجلس مقننہ کے لئے مجلس عاملہ کا انتخاب کرنا، اگرچہ بظاہر نظر بہ قابل اعتراض ہو، لیکن یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اور سوئیٹزرستان میں اس پر برابر عمل ہو رہا ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی مجلس جس کے نصف ارکان کو حکومت مقرر کرے اور نصف

لہ جائنٹ رپورٹ پارہ ۷۰۔
۲ له دی پریزنٹیٹو گورنمنٹ از مل باب ۹ (۴۳)

کو مجلس مقننہ منتخب کرے ایک معجون مرکب ہو گی،[1] ایک ایسی جماعت عاملہ کا وجود جو ہٹائی نہ جا سکتی ہو اور جسے ہمیشہ ایک با اختیار مجلس مقننہ کے روبرو رہنا پڑے ویسے بھی کافی دقت طلب ہے لیکن اگر اسی جماعت عاملہ میں بجائے اتحاد کے اختلاف کے عناصر ہوں تو یہ اس سے بھی نازک تر چیز ہو گی۔ یہ عجیب و غریب تجویز بھی اصلاحات مارلے کے پیدا کردہ ماحول کا ورثہ ہے اور اس لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔ لارڈ مارلے نے حکومت ہند اور صوبوں کی حکومتوں میں ہندوستانی عنصر کو داخل کر لیا تھا، تاکہ اس اثر کے علاوہ جو مجالس مقننہ کے ذریعہ قائم کیا جاتا ہے، جماعت عاملہ میں ہندوستانی صلاح کار رہیں، کانگریس لیگ اسکیم کے مصنفین نے اس خالص مشورہ کو نگرانی کی صورت میں بدل دینا چاہا۔ جیسا کہ مسٹر گوکھلے کا خیال تھا،[2] اس وقت تک جب تک کہ گورنر (یا گورنر جنرل) کو اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ ایسے غیر خیال کے لوگوں کو مقرر کر سکے جو ضرورت کے وقت رائے عامہ کے مقابلے میں حکومت کے طرفدار ہو جائیں، حکومت کے ہندوستانی عنصر کا برطانوی عنصر کے مساوی ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حق تقرر ہی کو حکومت عاملہ سے لے لیا جائے۔ اسی لئے جدید اسکیم میں یہ تجویز کی گئی کہ ہندوستانی ارکان کا انتخاب مجلس مقننہ کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔[3]

کانگریس لیگ اسکیم کی اشاعت کے آٹھ مہینے بعد مسٹر مانٹیگو نے سرکاری طور سے باضابطہ آئینی اصلاحات کے متعلق پہلا اعلان کیا۔ اور اس اعلان میں "ذمہ دارانہ" حکومت کے لفظ پر جو زور دیا گیا اس نے اگرچہ

---

[1] ظاہراً تو صوبہ کی اصلاح شدہ حکومت جس کی بنا ہی دوعملی پر ہے، ایک معجون مرکب ہے، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے کیونکہ ہر نصف ایک منفرد شئے ہے، نصف ناقابل تبدیل عنصر عاملہ پر مشتمل ہے اور نصف بلا واسطہ مجلس مقننہ کے سامنے جوابدہ ہے، اور ان میں سے ہر نصف کے فرائض جداگانہ ہیں۔

[2] یہ صوبوں کی حکومت کے متعلق تھا، حکومت ہند کے متعلق مسٹر گوکھلے کا خیال تھا کہ ایک ثلث ہندوستانی ارکان ہوں۔

[3] کانگریس لیگ اسکیم بھی کرٹس کی کتاب "دوعملی حکومت" میں شایع ہو چکی ہے، دیکھو صفحات ۹۰ تا ۹۵۔

کانگریس لیگ اسکیم کا خاتمہ کر دیا، لیکن چونکہ اس کے مقابل میں تجاویز کا کوئی دوسرا مجموعہ نہ تھا اس لئے یہ اسکیم اپنی جگہ پر علی حالہ باقی رہی۔

اواخر نومبر ۱۹۱۷ء میں لارڈ چیمسفورڈ اور مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کے نام سے ہیں اس وقت ایک عرضداشت پیش ہوئی جب وہ اس تحقیقات کا آغاز کرنے والے تھے جس کے نتائج جائنٹ رپورٹ کی شکل میں مرتب ہوئے تھے، یہ عرضداشت، جائنٹ اڈریس "سپاسنامہ متفقہ" کے نام سے مشہور رہی ہے، اور اس پر ممتاز یوروپی اصحاب تجارت، کلکتہ کے یوروپی جماعت کے بعض دوسرے ارکان اور بنگال کی اعتدال پسند قومی جماعت کے چند با اثر ہندوستانی رہنماؤں کے دستخط تھے۔ اس سپاسنامہ سے قوم پرستوں کے اس گروہ نے جس نے اس پر دستخط کئے تھے گویا کانگریس لیگ اسکیم کو مسترد کر دیا لیکن اس سپاسنامے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ قومی و سیاسی حیثیت سے دستخط کرنے والوں میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مگر اس کے ذریعہ سے مختلف گروہوں کے درمیان ایک اشتراک عمل کی صورت پیدا ہو گئی اور ۲۰ اگست والے مسٹر مانٹیگو کے اعلان کو باضابطہ تسلیم کرتے ہوئے انھوں نے بیان کردہ اصول کے مطابق ہندوستان کی آئینی ترقی کے لئے بعض قابل عمل تجاویز حکومت کے گوش گزار کیں۔

اس متفقہ سپاسنامہ کی ترتیب کے متعلق ابتدائی مجالس ۱۹۱۶ء کی خزاں میں سر ستیندر پرسنا سنہا کے (جو بعد میں لارڈ سنہا بن گئے) اور جو اس وقت حکومت بنگال کے ایک رکن تھے، دولت کدہ پر جیسا کہ [illegible] حکومت بنگال کا گرمائی صدر مقام ہے منعقد ہوئیں۔ مسٹر لائنل کرٹس کو بھی جو اس وقت اسی ملک میں یہاں کے سیاسی حالات کے مطالعہ میں مصروف تھے مدعو کیا گیا۔ اور انہی کے ان بارہ دفعات کے ماتحت جو دستخط کنندگان نے متفقہ طور پر طے کئے تھے اس یادداشت کو [illegible] منظور کر لیا۔ اسکیم کی توضیح کے ذمہ دار صرف مسٹر کرٹس تھے۔[1]

---

[1] [illegible] صفحہ ۲۲۳-۲۲۶ء

یہ اسکیم اجمالاً مفصلۂ ذیل تھی۔ اصلاحات کے مقصد کے لئے برطانوی ہند کے بڑے صوبوں کے بعض حصص کو اس کام کے لئے منتخب کیا جائے۔ ایک نئی قسم کی ریاستی حکومتیں عالم وجود میں لائی جائیں، ان ریاستی حکومتوں کی جماعت عاملہ وزرا پر مشتمل ہو، ان وزرا کا انتخاب حکومتی جمعیت کرے جسے عام رائے دہندوں نے انتخاب کیا ہو اور اسی کے سامنے وہ جواب دہ ہوں۔ اس ریاستی حکومت کا افسر اعلیٰ ایک چیف کمشنر ہو، تعلیمات، امور عامہ، زراعت، مقامی حکومت اختیاری وغیرہ کے محکمے کلاً یا جزاً اس جدید ریاستی حکومت کے حوالے کر دیئے جائیں، اور سات سال بعد ایک پارلیمنٹری کمیشن اس بات کو طے کرے کہ آیا باقی محکمے بھی منتقل کئے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ ہر ریاستی حکومت کو آمدنی کا ایک حصہ دیا جائے، اور رفتہ رفتہ صوبہ کی حکومتوں کے اختیارات نمائندگی محاصل و قانون سازی اس ریاستی حکومت کی مجلس کی طرف منتقل کئے جائیں۔ اس اثنا میں موجودہ صوبہ واری حکومتیں بھی باقی رہیں اور لگان، عدالت، کوتوالی وغیرہ محفوظ محکموں کا انتظام کریں، صوبوں کی مجالس مقننہ جو بیشتر ریاستی مجالس کے نمائندوں پر مشتمل ہوں مجالس شورے کے فرائض انجام دیں۔ واضح ہو کہ اس اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ مالیات و وضع قوانین کے متعلق جدید ریاستی مجالس اور حکومتوں کو ترقی کا موقع دیا جائے۔

مستقبل بعیدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس خیال کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ جب یہ ریاستی حکومتیں اس کو ثابت کر دیں گی کہ وہ اپنے اختیارات کو جن میں قیام امن و امان کے ضروری اختیارات بھی شامل ہیں، نہایت اچھی طرح استعمال کرنے کے لائق ہو گئی ہیں اور وہ فرائض جن کو یہ حکومتیں صوبوں کی حکومتوں کے ساتھ مل کر انجام دیتی تھیں، اچھی طرح انجام دیئے جا رہے ہیں، اسی گھڑی صوبوں کی حکومتوں کے لئے وہ وقت آجائے گا جبکہ وہ اپنے باقی فرائض سے سبکدوش ہو کر ان ریاستی حکومتوں کے حق میں دست بردار ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی اگر کوئی انتظامی تخریب رونپذیر ہوئی تو صوبہ کی حکومت کو بالکل اسی طرح جس طرح حکومت کو اسی قسم کی صورت حال کے موقع پر دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل اندازی کا حق حاصل ہے

دخل اندازی کا اختیار ہو گا۔

سب سے آخر میں جب برطانوی ہند کے بیشتر حصص میں ریاستی حکومتیں مکمل طور سے قائم ہو جائیں گی تو اس وقت ایک ایسا دستور منضبط کیا جائے جس کے ذریعہ خود حکومت ہند ایک ہندوستانی پارلیمنٹ اور عام رائے دہندوں کے سامنے ذمہ دار بنا دی جائے گی۔

اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "متفقہ سپاسنامے" میں جو اسکیم بیان کی گئی ہے وہ یادداشت ڈیوک کی طرح دوعملی کے اصول پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کبھی انھی مقدمات سے ابتدا کی گئی تو کوئی دوسرا اصول قائم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ مقدمات مختصراً اس طرح بیان کئے جا سکتے ہیں (۱) کہ کسی نہ کسی قسم کی ذمہ دارانہ حکومت کی فوراً ابتدا کرنی ہے۔ (۲) کہ ذمہ دار حکومت کا پہلا قدم صوبہ کی حکومت میں رکھا جانا چاہئے۔ (۳) اسی محدود میدان میں کامل ذمہ دار حکومت ملک کی سلامتی یا کامیابی کی حقیقی امید پر فوراً قائم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن تم دیکھتے ہو کہ "سپاسنامے" میں اس اصول کا بالکل ہی دوسری طرح انطباق کیا گیا ہے یادداشت ڈیوک میں جس دوعملی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ صرف فرائض کی تقسیم پر مبنی ہے لیکن "سپاسنامے" کی تجویز میں صوبوں کی تقسیم بھی کر دی گئی ہے۔ اول الذکر یادداشت کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ صوبہ واری حکومتیں دو حصوں میں تقسیم کر دی جائیں، لیکن موخر الذکر "سپاسنامے" کا مقصد یہ ہے کہ ان کے دوش بدوش چند بالکل جدید و جداگانہ حکومتیں قائم کی جائیں۔

اس دعوے میں کہ بعض بڑے صوبہ ناقابل انتظام اور ضرورت سے زیادہ وسیع ہیں ایک بڑی حد تک حقیقی قوت مضمر ہے، اور اگر آج کی سیاسی صورت حال میں یہ قابل اعتراض ہے، تو اس وقت جبکہ ہندوستانی سیاسی زندگی ایک بڑی حد تک ترقی کر چکی ہوگی، اور حکومت کو متعدد فرائض انجام دینے ہوں گے، اور بھی زیادہ خطرناک صورت ہو جائے گی۔ ہندوستان کا نقشہ بعض ایسی صورتیں پیش کر رہا ہے جو زبان حال سے چلا کر یہ کہہ رہی ہیں کہ کسی نہ کسی قسم کی تبدیلی لازمی ہے، مثلاً سندھ کا، جو اپنی کثیر مسلم آبادی

اپنی مخصوص زبان، تاریخ اور روایات کے اعتبار سے ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، صوبۂ بمبئی سے تعلق ایک عنصر فطری الحاق ہے؛ اسی طرح اڑیسہ کا تعلق بہار سے اور برار کا صوبۂ متوسط سے قابل اعتراض ہے۔ اسی بنا پر جائینٹ اڈریس (متفقہ سپاسنامہ) میں بتایا گیا ہے کہ ذمہ دار حکومت کی ترویج سے پہلے سب سے اولیں کام یہ ہونا چاہئیے کہ ان حلقوں کا انتخاب کیا جائے جو حقیقی معنی میں پارلیمنٹی اصول پر حکومت اختیاری کے لایق ہوں؛ یعنی وہ علاقے ایسے ہوں جو متفقہ و یکساں انتظامی حلقے بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں؛ مثلاً یہ کہ ان کی تاریخ میں توحد کی کیفیت ہو اور وہ کم از کم ایک ہی قوم، زبان اور مذہب کے افراد پر مشتمل ہوں۔

ان تجاویز کی صداقت کی تردید یا ہندوستانی سیاسی زندگی کے موجودہ خاکہ کے نامکمل ہونے کی طرف سے اغماض ناممکن ہے۔ ممکن ہے کہ محض نظری حیثیت سے "متفقہ سپاسنامہ" کی مرتبہ اسکیم بہترین اسکیم ہو لیکن عملاً نفس اسکیم کی صورت حال اس کو برا بتاتی ہے نظری تدبر کے اصول کے مطابق کسی ایک خاص نقشہ کے مطابق کسی چیز کے بنانے کے معنی بدقسمتی سے یہ ہیں کہ پرانا نقشہ بالکل مٹا دیا جائے، اور تعمیر سے عموماً اور تعمیر جدید سے خصوصاً اکثر یہ مراد ہوتی ہے کہ پرانے مکان کو جڑ سے اکھیڑ دیا جائے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں جذبات ہی حکومت کی گویا بنیاد ہیں، عملی حیثیت سے تخریبی کام بہت ہی مہلک ہوتے ہیں۔ آؤ مثال کے طور پر ہم اس اسکیم کو بنگال پر منطبق کر کے دیکھیں جن لوگوں نے ان برافروختہ جذبات کو جو لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کی وجہ سے وہاں پیدا اور ان مشتعل احساسات کو جو صرف ایک ضلع کی تقسیم سے رونما ہوئے تھے، دیکھا ہے، وہ اس اسکیم کو جنون سے کچھ ہی زیادہ وقعت دیں گے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا "متفقہ سپاسنامے" نے جس اسکیم کی سفارش کی ہے، اس کا مقصد صرف یہی نہیں کہ ہندوستان کے صوبوں کو منقسم کیا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ ذمہ دار حکومت ملنے سے پہلے موجودہ ادارات کا بھی خاتمہ کر دیا جائے؛ صوبوں کی مجالس مقننہ

کے ساتھ جن کو لوگ چھوٹی چھوٹی پارلیمنٹ سمجھتے ہیں یکے بعد دیگرے دونسلوں کی سیاسی توقعات اور امیدیں وابستہ ہیں بنگال میں ۱۹۱۲ء سے اس مجلس کو ارکان کی اکثریت کی خصوصیت حاصل رہی ہے اور اسی اکثریت کے قبضہ میں وضع قوانین کے اختیارات ہیں لیکن جس اسکیم پر ہم اس وقت غور کر رہے ہیں اس کے مطابق مجلس مقننہ بنگال اپنے اختیارات سے معرا ہو کر خود اپنے وجود کو ان چند ریاستی مجالس میں جو اسکیم کے ذریعہ قائم ہوتی ہیں فنا کر دیتی ہے لارڈ کرزن نے مقبول عام بنگالی جامعہ کلکتہ کی اصلاح کی (جسے ان کے ناقدین تخریب سے تعبیر کرتے ہیں) کوشش کی تھی، اور اس کی جو سخت مخالفت کی گئی اور حقارت آمیز طریقہ سے اسے دیکھا گیا اس سے اس مخالفت کا تھوڑا سا شائبہ نظر آتا ہے جو مجلس مقننہ بنگال پر ہاتھ لگانے سے پیدا ہوتی۔

مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ کے مصنفین نے اس قسم کے عملی تجربات کی روشنی میں "متفقہ سپاسنامہ" پر کافی غور کرنے کے بعد بلا تامل اسے مسترد کر دیا۔ تاہم انھوں نے نہایت پر زور الفاظ میں اس بات کی سفارش کی کہ اصلاح شدہ حکومت صوبہ کے اولین فرائض میں یہ ہونا چاہئے کہ وہ ماتحت صوبوں کے حدود کے صحیح تعین کے مطابق لوگوں کی رائے معلوم کرے، اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی صورت پر غور کرے اور مثال کے طور پر بہار اڑیسہ کا ماتحت صوبہ پیش کیا گیا۔[۱] ۱۹۱۹ء کے (اصلاحی) قانون کی دفعہ ۱۵ (۱) میں اس قسم کے ماتحتی صوبوں کے بنانے اور ان کو ضروری حکومتی اختیارات دینے کی خاص سہولتیں مہیا کی گئی ہیں، اسی دفعہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ "غیر ترقی یافتہ علاقوں" پر علیحدہ غور کیا جائے اور ان کی ضرورتوں کے مطابق ان کا نظام حکومت ترتیب دیا جائے۔

اب ہم سرکاری اسکیم تک پہونچتے ہیں جو عالمانہ جائنٹ رپورٹ کی شکل میں پیش کی گئی لیکن یہاں اس اسکیم پر وضاحت کے ساتھ بحث کرنا ضروری نہیں ہے

[۱] دیکھو جائنٹ رپورٹ پارہ ۲۴۵۔ جائنٹ سلیکٹ کمیٹی (متفقہ منتخب کمیٹی) نے مسودہ (اصلاحی) کی دفعہ ۱۵ پر اظہار رائے کرتے ہوئے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

کیونکہ اس کا بیشتر حصہ ہندوستان کے اصلاح شدہ آئین کا جز ہے اور آئندہ باب میں مستقل طور سے اس پر بحث کی گئی ہے۔ تاہم دوسری ابتدائی اسکیموں کے تجزیہ و مطالعہ کے وقت اس بات پر غور کرنا کہ سرکاری اسکیم کن اصول پر مبنی ہے، یقیناً سودمند ہوگا۔ مختصراً یہ اسکیم ان خیالات کی بڑی حد تک تائید کرتی ہے، جو کانگریس لیگ اسکیم میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ اس اسکیم میں ان امیدوں کو جو ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں اور کبھی بھی پوری نہیں ہوئیں اور ۲۰ اگست کے اعلان کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی اور ساتھ ہی ذمہ دارانہ حکومت کی مبادی کے طور پر جو کیفیات پیدا ہونی چاہئیں انھیں بھی اس میں پیش نظر رکھا گیا۔

کانگریس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اصلاح شدہ مجالس کو ایک وسیع حلقۂ انتخاب پر ہمہ گیر پارلیمنٹی مجالس بنادیں۔ کانگریس نے جو تجویز پیش کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ موجودہ حکومت کو بیکار کرکے نظام حکومت بالکل مفلوج ہو جاتا۔ اس تعطل کو اس طرح دور کیا جاسکتا تھا کہ ایک طرف تو گورنر (یا گورنر جنرل) کو انتظامی حکومت کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے مخصوص حالات کے اندر مجلس مقننہ کی تجاویز کو مسترد کرنے کا اختیار دے دیا جائے اور دوسری طرف جماعت عاملہ کے ہندوستانی ارکان کے انتخاب کی تجویز کو مسترد کردیا جائے۔ یہی وہ اسکیم تھی جسے "پانچ صوبہ داروں کی اسکیم" کہتے ہیں۔ جنوری ۱۹۱۹ء میں پنجاب، صوبجات متحدہ اور برما کے لفٹننٹ گورنروں اور صوبۂ متوسط اور آسام کے چیف کمشنروں نے یہ اسکیم تیار کی تھی ان کو یقین کامل تھا کہ دوعملی حکومت عملاً خطرناک اور ناقابل عمل ہے اور جب وائسرائے نے ان سے اس کی بجائے دوسری اسکیم کا مطالبہ کیا تو انھوں نے یہ اسکیم پیش کی۔ ان صوبوں کے پانچ اعلیٰ افسروں کی تجویز تھی کہ صوبہ کی جماعت عاملہ ایک گورنر اور ایک مجلس عاملہ پر مشتمل ہو، اور اس مجلس عاملہ کے نصف ارکان نہ صرف یہ کہ ہندوستانی ہوں بلکہ مجلس مقننہ کے منتخب ارکان میں سے ان کا انتخاب کیا جائے۔ صوبہ کی مجلس مقننہ عمومی اصول پر قائم کی جائے

اور وہ وضع قوانین اور مالیات کے متعلق تمام اختیارات کی مالک ہو، لیکن گورنر کو حکومت کے اعلیٰ افسر کی حیثیت سے جو اختیارات حاصل ہوں ان کے ساتھ ہی ساتھ اسے مجلس مقننہ کی تجویز کو مسترد کرنے کا بھی حق دیا جائے۔ جائنٹ رپورٹ کے مصنفین نے صرف یہی منظور نہیں کر لیا بلکہ انھوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور یہ تجویز کی کہ ایک محدود حد تک مستقل محکموں میں (الف) صوبہ کی جماعت مقننہ کو غیر محدود اختیارات حاصل ہوں۔ اور (ب) ہندوستانی وزراء جو ان محکموں کے ذمہ دار ہوں، حکومت صوبہ کی ایک مستقل علیحدہ شاخ ہوں۔ اور نہ صرف یہ کہ ان کا منتخب ارکان میں سے انتخاب کیا جائے بلکہ وہ پارلیمنٹ کی اصطلاح کے مطابق مجلس مقننہ کے سامنے جوابدہ ہوں۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس کے علاوہ ۲۰ اگسٹ کے اعلان کو حقیقی طور سے عملی جامہ پہنانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔

جائنٹ رپورٹ کا اصول بالکل صاف و واضح ہے اور وہ اس وقت اور واضح ہو جاتا ہے جب ہم اس کا ان لوگوں کے رویہ سے مقابلہ کرتے ہیں جنھوں نے دفعات اعلان کو تنگ تر اور معاندانہ طریقے سے دیکھا تھا "متفقہ سپاسنامہ" اس رویہ کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس اڈریس میں جس اسکیم کی توضیح کی گئی ہے اس کے مطابق صرف اُن مجالس کو (یعنی ریاستی مجالس و ریاستی وزراء کو) پارلیمنٹی حقوق ملتے جن کے سامنے وہاں کی جماعت عاملہ جواب دہ تھی رہیں صوبہ کی وہ حکومتیں جو محفوظ محکموں کا انتظام کرتی تھیں وہ استبدادانہ تھیں، اور اس حقیقت کو چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس اسکیم کے مطابق صوبہ کی مجالس مقننہ (لارڈ مارلے کے خیال کے مطابق) صرف مجالس شوریٰ کی حیثیت سے باقی رہتیں اس کے علاوہ چونکہ سرکاری ارکان کی تعداد اقلیت محض تک پہونچ جاتی اس لئے وہ انتظام ملکی کے سلسلہ میں ایسے قوانین کے منظور کرانے کے قابل بھی نہیں رہتی جو ضروری ہوں حالانکہ اس کام کی تمام تر ذمہ داری صرف صوبہ کی حکومت پر ہی عاید ہوتی۔

الغرض جائینٹ رپورٹ نے "متفقہ سپاسنامہ" کے بالکل خلاف ایک طرف تو حکومت صوبہ کے ڈھانچہ کو علی حالہ قائم رکھنے کی تائید کی اور دوسری طرف اس نے انڈین نیشنل کانگریس کی اس تمنا کی حمایت کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ جہانتک ممکن ہو مارلے والی مجالس کو حقیقی پارلیمنٹی مجالس بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی پانچ صوبہ داروں کے خلاف اس رپورٹ نے موجودہ طریقہ حکومت کے ڈھانچہ کے اندر ایک واقعی ہندوستانی جماعت کو اختیارات تفویض کرنے کی تائید کی جو ایک بڑی حد تک ہندوستانی مجالس مقننہ کے سامنے جواب دہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی مارلے والی اصلاحات کے اصول کو عجیب طریقہ سے باقی رکھنے کی کوشش کی گئی تھی، یہ تجویز کی گئی کہ ایسے قوانین کی منظوری کے لئے جو محفوظ محکموں کے مفاد کے لئے ضروری ہوں ان اصلاح شدہ مجالس مقننہ صوبہ کے ارکان کی (جن میں ⅘ منتخب ارکان ہونے قرار پائے) ذیلی جماعتہائے اعلےٰ (گرینڈ کمیٹیز) بنائی جائیں جن میں اکثریت نامزد شدہ ارکان کی ہو۔ اسی قسم کے ایسے ہی اختیار کی مجلس مرکزی جماعت مقننہ کی مجلس مملکت (کونسل آف اسٹیٹ) ہے۔ منتخب کمیٹی نے ۱۹۱۹ء کی سرکاری اصلاحی اسکیم پر جو ۱۹۱۹ء کے مسودۂ حکومت ہند پر مشتمل تھی، ان جماعتہائے اعلیٰ کو توڑ دیا، لیکن مجلس مملکت کو ایک معمولی ایوان دوم اور سادہ نظر ثانی کرنے والے ایوان کی حیثیت سے باقی رکھا۔ اس کے ساتھ یہ طے کیا گیا کہ جب ضروری قوانین کی منظوری کی ضرورت پڑے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ ایسے مواقع پر گورنر (یا گورنر جنرل) اپنے خاص اختیارات استعمال کرے نہ کہ ان اختیارات کو چھپانے کے لئے ایک اتنا وسیع دستوری قلعہ تعمیر کیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی اچھا نہیں سمجھا گیا کہ سرکاری گروہ (آفیشل بلاک) کے قدیم سلسلے کو کسی نہ کسی صورت میں بھی قائم رکھا جائے۔

متفقہ منتخب کمیٹی نے مجالس مقننہ کے مرتبہ و اختیارات کی بہتری کے لئے بعض دوسری ایسی تبدیلیاں بھی کیں: ایک معمولی لیکن ممتاز تبدیلی یہ تھی کہ مجالس مقننہ میں سرکاری صدر یعنی گورنر کے بجائے ایک منتخب شدہ صدر

(صرف پہلے چار سال تک حکومت کی طرف سے مقرر شدہ) ہو؛ ایک دوسری تبدیلی یہ تھی کہ جماعت مقننہ ہند ایوان زیریں یعنی جمعیت مقننہ (لیجسلیٹو اسمبلی) کو اخراجات کے متعلق تمام حقیقی پارلیمنٹی حقوق حاصل ہوں۔

آخر میں ہم کو اس سرکاری اصلاحی اسکیم کا ہندوستان میں جس طرح استقبال کیا گیا اس کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہئے۔ ان یوروپی اصحاب کی رائے بھی جو ہندوستان کی امیدوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے ایک بڑی حد تک مخالفانہ تھی، اور سب سے زیادہ مخالفت اس جدید دوعملی حکومت کے اصول کے مطابق تھی وہ اس پر پانچ صوبہ داروں کی اسکیم کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اور ان تجاویز کے اصول بہتر طریقہ سے سمجھ میں آنے لگے تو رائے میں ایک بڑی حد تک تبدیلی ہوگئی، اور سرکاری وغیر سرکاری حلقوں میں یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ذمہ دار حکومت تک پہنچنے کے لئے اس کے سوا کوئی دوسری صحیح وعملی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔

قوم پرور جماعت کے تمام گروہ ان تجاویز کو ناقابل اطمینان بتانے میں متفق تھے جو حکومت ہند اور وزیر ہند کے متعلق تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ صوبوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ہی حکومت ہند کے بعض مرکزی محکموں کو بھی منتقل کر کے حکومت ہند میں بعض ذمہ دار عناصر کی ترویج کرنی چاہئے، اور اس کے ساتھ انھوں نے اس مطالبہ کی، جو کانگریس لیگ اسکیم میں تھی تائید کی کہ اس مجلس (یعنی انڈیا کونسل یا مجلس ہند) کو جو وزیر ہند سے متعلق ہے توڑ دیا جائے۔ ان کا قول تھا کہ وائٹ ہال سے ہندوستان کے معاملات پر حکومت کرنا ہندوستان کے اس مرتبۂ جدید اور سیاسی خودداری کے منافی ہے جو اسے ملی ہے

متفقہ منتخب کمیٹی نے ان خیالات کے متعلق ہر قسم کے دلائل سننے کا پورا موقع دیا، لیکن گو دوعملی حکومت کو معتدلانہ طریقہ سے رائج کرنے کا کمیٹی سے مطالبہ کیا گیا لیکن اسے، اس نے مذکورۂ بالا اسباب کی بنا پر مسترد کر دیا۔ ساتھ ہی مجلس ہند

لہ دیکھو گزشتہ صفحات انگریزی ۴۶، ۴۵۔

سے کسے متعلق ایک ذیلی جماعت مقرر کی گئی جس کے صدر لارڈ کریو تھے
اس نے ایک حد تک مجلس ہند کو توڑ دینے کی تجویز پیش کی تھی لیکن
اسے بھی جائینٹ کمیٹی نے مسترد کر دیا اس کے وجوہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان
کئے ہیں سلہ
"کمیٹی مجلس ہند کو توڑنے کے موافق نہیں ہے ان کا خیال یہ ہے کہ
ابھی عرصہ تک وزیر ہند کو اس بات کی ضرورت باقی رہیگی کہ وہ ہندوستان
کے متعلق تجربہ کار اشخاص کے مشوروں سے مستفید ہوں نیز کمیٹی کو اس
بات کا یقین کامل ہے کہ اگر باضابطہ ایسی کوئی مجلس نہ بھی رہی تو وزیر ہند کو
ایک ایسی بے ضابطہ مجلس ترتیب دینا ہی پڑیگی؛ اس لئے ان کی رائے میں
یہ بہتر ہے کہ ایک ایسی مجلس کو جس کے ساتھ روایات و اختیارات وابستہ
ہیں باقی ہی رہنے دیا جائے"
یہ تو ایک واضح حقیقت ہے کہ جوں جوں خود ہندوستان میں ذمہ دار
حکومت کا میدان وسیع تر ہوتا جائے گا اس مجلس کے فرائض محدود تر ہوتے
جائیں گے۔
مجوزہ اصلاحات کی دوسری چیزوں کے متعلق ہندوستانی رائے
عامہ میں سخت اختلاف تھا واقعہ یہ ہے، جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، ہندوستان
کی ان جماعتوں میں جن میں سے ایک تدریجی ترقی کی حامی ہے اور دوسری جو
کسی قسم کی سیاسی غلامی کو فضول سمجھتی ہے، اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی
اعتدال پسند گروہ کی جماعتیں یکے بعد دیگرے الگ ہونے لگیں، اور اس
کے ساتھ ہی انتہا پسند قوم پروروں نے انتہائی مطالبات پیش کرنے شروع
کر دیے ہیں[۲] اگسٹ ۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ پر غور کرنے کے لئے
انڈین نیشنل کانگریس کا جو مخصوص اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، اس میں اس قسم

سلہ منقول از رپورٹ متعلقہ دفعہ ۱۳۱ (اصلاحی) مسودہ۔
سلہ ۱۹۲۰ء میں انتہا پسند جماعت صریحاً انقلاب پسند ہو گئی ہے اس پر آئندہ باب میں بحث کی گئی ہے

کی تجاویز منظور کی گئیں کہ تمام برطانوی ہندوستان کو ۱۵، اور صوبوں کو ۶ سال کے اندر کامل ذمہ دار حکومت دیدی جائے اور اس اثنا میں قانون، عدالت اور پولیس کے محکمے بدستور محفوظ رہیں۔ اس کے چار مہینے بعد ہی کانگریس کے سالانہ اجلاس میں صوبوں کی فوری کامل ذمہ دار حکومت کا مطالبہ پیش کر دیا گیا۔

۱۹۱۸ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ایک تحریک منظور کر کے (جس کو بعد میں وفد کانگریس نے متفقہ منتخب کمیٹی کے سامنے بھی پیش کیا) یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے جدید آئین میں ایک "اعلان حقوق" بھی شامل ہونا چاہیے۔ اس کی دو خاص دفعات یہ تھیں:۔

"(ب) کہ ملک معظم کی ہندوستانی رعایا کا کوئی رکن کسی عدالت عامہ میں عام قانونی مقدمہ میں سزا پائے بغیر کسی وقت بھی اپنی آزادی جان، مال یا آزادی تحریر یا تقریر، یا کسی جماعت کی شرکت سے محروم نہ رکھا جائے گا"

"(د) کہ مطابع آزاد ہوں گے، اور رجسٹری کے وقت کسی اخبار یا مطبع سے کسی قسم کی کوئی ضمانت نہ لی جائے گی"

ان مطالبات کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی تشریح کی ضرورت ہے۔ تجربہ سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ طویل تعویق اور گواہوں کی منظم تخویف کی وجہ سے عام قوانین ان "نراجی" جرائم کو جیسے کہ لارڈ کرزن کی ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال کے بعد ہونے لگے تھے، موثر طریقہ سے انجام نہیں دے سکتے تھے، ۱۹۱۵ء میں جنگ کے زمانے میں قانون مدافعت ہند بنایا گیا، اور اس سے حکام پہلی مرتبہ اس قابل ہوئے کہ وہ نراجی تحریک کے سلسلہ میں جو قتل و غارت گریاں ہو رہی تھیں، ان کی موثر طریقہ سے روک تھام کریں۔ اس کے ذریعہ سے جو اختیارات دئے گئے تھے وہ یہ تھے:۔ (۱) کہ خطرناک سیاسی مشتبہ اشخاص کو، ان کے گھروں میں یا کسی دوسری جگہ، نظر بند کر دیا جائے۔ (۲) ان اشخاص کے جو خطرناک سیاسی جرائم کے مرتکب ہوں، مقدمات ایسی جماعتی عدالتوں میں پیش ہوں جو اعلیٰ ترین عدالتی اشخاص سے مرکب ہوں،

لیکن ان کا طریقۂ کار عام عدالتوں سے زیادہ سرسری ہو۔ سر سڈنی راؤلٹ کی زیر صدارت (جو کورٹ آف کنگس بنچ کے ایک جج تھے) ایک زبردست تحقیقاتی کمیٹی جس میں دو ہندوستانی ارکان بھی تھے ۱۹۱۸ء میں بنائی گئی اس کا کام یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی نراجی تحریکات کی تحقیقات اور ان ذرائع پر جو اختتام جنگ پر قانون مدافعت ہند کے اٹھ جانے کے بعد عمل میں آئیں گے، خصوصیت کے ساتھ غور کرے۔ حالات کی کامل تحقیقات کے بعد کمیٹی نے متفقہ طور سے اس بات کی سفارش کی کہ ایک ایسے قانون کی جو قانون مدافعت ہند کے اصول پر ہو تعزیرات ہند میں بڑھانے کی ضرورت ہے۔ حکومت ہند نے اس سفارش کو عملی جامہ پہنایا، اور تقریباً متفقہ و مسلسل مخالفت کے باوجود یہ قانون تین سال کیلئے تعزیرات ہند میں داخل کر دیا گیا عام طور پر اس قانون کو "راؤلٹ قانون" کہتے تھے اور اگرچہ ہندوستان کے کسی حصہ میں بھی اس سے کام نہیں لیا گیا، لیکن اس کے ذریعہ حکام کو قانون مدافعت ہند کی طرح خطرناک سیاسی جرائم کے انسداد کے لئے ضرورت کے وقت خاص اختیارات کے استعمال کا موقع مل گیا۔

تجربہ نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اگر اخبارات یا تقریروں کے ذریعہ اشتعال انگیز خیالات کی اشاعت کی جا رہی ہو تو ان کے انسداد کے لئے بھی خاص اختیارات کی ضرورت ہے۔ اس خیال سے عام قوانین کے علاوہ سنہ ۱۹۱۰ء کا قانون مطابع اور سنہ ۱۹۱۱ء کا قانون مجالس باغیانہ، تعزیرات ہند میں شامل کر دیئے گئے، حالانکہ عملاً برطانوی ہند میں بڑی حد تک آزادی تحریر و تقریر حاصل ہے۔

اب ان واقعات کی روشنی میں ہم کو نیشنل کانگریس کے اس مطالبہ پر جو اعلان حقوق کے نام سے مشہور ہے، غور کرنا مناسب ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مجلس مقننہ کے حقوق کو اس طرح کے کسی تحریری وثیقہ کے ذریعہ سے مسدود کرنا برطانوی دستور کی روایات کے بالکل خلاف ہے، اگر ہندوستان کی رائے عامہ "راؤلٹ قانون" قانون مطابع، قانون مجالس باغیانہ

وغیرہ کو منسوخ کرنے کی حمایت میں ہو تو یہ کام مجلس مقننہ ہند کا ہے، جسنے (عہد اصلاح سے پہلے) ان کو تعزیرات ہند میں شامل کیا تھا۔ اس قسم کے قانون کے متعلق جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا جارہا تھا، ان کے مطابق بہترین طریقہ کار وہی تھا، جو حکومت ہند نے اختیار کیا، اس نے اصلاح شدہ مجلس مقننہ ہند کے ارکان کی دو کمیٹیاں مقرر کیں، جن میں سے ایک کا مقصد یہ تھا کہ قانون مطابع کے نفاذ پر غور کرے اور دوسری کا یہ تھا کہ وہ راؤلٹ قانون اور قانون مجالس باغیانہ کے قسم کے قوانین کی ضرورت و حدود کے متعلق واقعات کا مطالعہ کرے۔

ان دو کمیٹیوں نے جو رپورٹیں پیش کی تھیں، ان پر حکومت ہند کارروائی کر چکی ہے ستمبر ۱۹۲۱ء میں مجلس مقننہ ہند میں قانون مطابع اور جنوری ۱۹۲۲ء میں مجلس مملکت میں بعض استبدادانہ قوانین کی، جن میں قانون مدافعت ہند (جو زمانۂ جنگ میں منظور ہوا تھا) اور راؤلٹ قانون شامل تھے، تنسیخ کی تجاویز پیش کی گئیں۔ ان قوانین پر غور کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی تھی، اس نے اس قاعدے پر کہ بلا کسی مقدمہ کے کسی کو آزادی سے محروم کر دیا جائے، یہ تنقید کی : کہ یہ اصول موجودہ اصلاحات کے منافی ہے۔ یہ تینوں مسودے اب قانونی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اب اس قسم کے صرف دو قانون منسوخ ہونے سے باقی رہ گئے ہیں، ان میں سے ایک تو فوجداری قانون ترمیم تعزیرات ہند حصہ ۲ ۱۹۰۸ء ہے جس کے ذریعہ سے انقلابی جماعتوں (مثلاً جماعت رضا کاران) کو توڑا جا سکتا ہے، اور دوسرا قانون مجالس باغیانہ ہے جس کے ذریعہ سے انقلابی مجالس بند کی جا سکتی ہیں۔ اس کمیٹی نے (جو دو یورپین اور سات ہندوستانی ارکان پر مشتمل تھی اور جس کا صدر حکومت ہند کا قانونی رکن تھا جو خود ہندوستانی تھا) اپنی رپورٹ مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء میں لکھا ہے کہ "موجودہ خطرناک صورت

کو جو آئندہ چل کر اس سے بھی زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے، پیش نظر رکھتے ہوئے، ہماری رائے میں یہ ایک عاقبت اندیشانہ فعل ہوگا کہ ان قوانین کی تنسیخ کسی بہتر وقت تک کے لئے ملتوی کر دی جائے[۱]"

---

[۱] مجلس مقننۂ ہند کی درخواست پر ایک اور کمیٹی بھی مقرر کی گئی ہے جو (مارچ ۱۹۲۳ء) ان مخصوص قومی مراعات پر جو قوانین کے ذریعہ یوروپین (اور امریکن) اصحاب کو حاصل ہیں، غور کر رہی تھی۔ عدالت فوجداری میں جو خاص رعایت کسی یوروپی برطانوی رعایا کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس کے مقدمہ کی سماعت ایک ایسی جوری کرے گی جس کے کم از کم نصف ارکان یوروپین (یا امریکن) ہوں گے۔

باب (۴)

اصلاح شدہ آئین

۱۹۱۹ء کا قانون حکومت ہند[۱] ہندوستان کے جدید دستور کا قانونی ڈھانچہ ہے۔ ان قوانین کی طرح جن پر بڑی بڑی برطانوی نوآبادیوں کی ذمہ دار حکومت کی مجالس کا انحصار ہے، یہ بھی برطانوی پارلیمنٹ کا قانون ہے۔ بایں ہمہ یہ ۱۹۱۹ء کا قانون مکمل یا ہمہ گیر طریقہ کا قانون نہیں ہے۔ عملاً تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ ترمیمی قسم کا قانون ہے، اور اس کی دفعات جن کے ذریعہ سے ہندوستانی دستور میں بعض نہایت اہم تبدیلیاں ہو گئی ہیں، قانون حکومت ہند ۱۹۱۵ء ہی میں درج کر دی گئی ہیں۔ یہی وہ قانون ہے، جس کے ذریعہ سے سب سے پہلے تمام برطانوی ہند کے لئے ایک دستور بنایا گیا۔ موخرالذکر قانون اپنی ترمیمات کے بعد "قانون حکومت ہند" کے نام سے موسوم ہوگا اور اس کے بعد جو بھی تبدیلیاں ہوں گی وہ اس کی (یا بعد میں اس کے ماتحت جو قواعد مرتب کئے جائیں) ترمیم ہی کہلائی جائیں گی۔[۲] اس کے علاوہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، یہ ۱۹۱۹ء

---

[۱] دیکھو دفعہ ۴۷ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء۔

کا قانون حکومت ہند اگرچہ ہندوستان کے جدید قانون کا آئینی ڈھانچہ ہے تاہم بہت سے تفصیلی امور ایسے ہیں جنھیں اس میں ہاتھ نہیں لگایا گیا چنانچہ قانون کے ساتھ جو ضمیمی قواعد بنائے جائینگے، وہ اس کمی کو پورا کریں گے۔ یہ صورت حال ہندوستان کے مروجہ اصول وضع قوانین کے بالکل مطابق ہے اور اس سے دوہرا کام انجام پاتا ہے، ایک طرف تو پارلیمنٹ ان تفصیلات کی زحمت سے بچ جاتی ہے جو ہندوستان ہی میں بہتر طریقہ سے طے کی جاسکتی ہیں اور دوسری طرف یہ امر نہایت آسان اور سہل ہو جاتا ہے کہ اگر تجربہ یا سیاسی ترقی کے اعتبار سے کوئی تبدیل کرنی مناسب ہو تو اسے فی الفور عمل میں لے آیا جائے۔ ان قواعد کا یا ان میں جو بھی تبدیلیاں ہوں گی ان کی حکومت ہند ذمہ دار ہوتی ہے (البتہ وزیر ہند کی منظوری ضروری ہے) لیکن آخری تصدیق کے لئے ان کو مسودہ یا آخری صورت میں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہ قواعد آخری صورت میں پیش کئے جائیں تو پارلیمنٹ تیس دن کے اندر تاج کی خدمت میں عرضداشت پیش کر کے اس بات کی درخواست کر سکتی ہے، کہ اس قاعدہ کو منسوخ کر دیا جائے۔ لیکن اگر مسودہ کی صورت میں پیش کئے جائیں، تو وہ دونوں ایوانوں کی ایک تجویز کے بعد علی حالہ یا ترمیم کیساتھ منظور کر لیا جاتا ہے[له]۔ اس قانون کے ماتحت جس قدر قواعد مرتب کئے گئے، ان کے لئے موخر الذکر طریقہ ہی کام میں لایا گیا۔ مسودات اپنی آخری صورت میں پیش کئے گئے اور پارلیمنٹ نے ان مسودات کو جن کو حکومت ہند نے ترتیب دیا تھا، اور جن کو بعد میں دونوں ایوانوں کے ارکان کی متفقہ منتخب کمیٹی کی سفارشوں کے بعد جس نے خود اس قانون پر نظر ثانی کی تھی منظور کر لیا گیا۔ اس طرح سے جو قواعد بنائے گئے، ان کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی، اور ہندوستان کی کوئی مجلس مقننہ بھی ان میں کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ نہیں کر سکتی۔

سنہ ۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند کو ۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء کو شاہی منظوری

له مقابلہ کرو دفعہ ۴۴ (نیز دفعہ ۳۳) قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ء۔

عطا ہوئی۔ اس کے بعد سال کا تقریبًا بیشتر حصہ اس قانون کے ماتحت قواعد اور رائے دہندوں کی فہرستوں کی ترتیب میں صرف ہوا۔ متفقہ منتخب کمیٹی نے ان قواعد کے مسودات پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا کہ "حکومت ہند اور مقامی حکومتوں نے اس بڑے کام کو نہایت خوبی سے انجام دیا ہے"[1]۔ نومبر میں انتخابات عمل میں آئے، جنوری ۱۹۲۱ء کے پہلے ہفتہ میں اصلاح شدہ آئین کے مطابق جماعتہائے عاملہ عالم وجود میں آئیں، اور جنوری و فروری میں صوبوں کی اصلاح شدہ مجالس مقننہ کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔ ۹ر فروری ۱۹۲۱ء کو ڈیوک آف کناٹ نے باضابطہ جماعت مقننۂ ہند کا افتتاح کیا۔ اس کے ایک دن پہلے ڈیوک نے ایوان والیان ریاست (نرندر منڈل) کا افتتاح کیا تھا اور اس طرح ان بے ضابطہ مجالس کو مستقل شکل دیدی گئی جن کو بڑے بڑے والیان ریاست منعقد کیا کرتے تھے اور جن میں دیسی ریاستوں کے مسائل پر خصوصًا، اور ان مسائل پر جو ان کے اور برطانوی ہند دونوں کی دلچسپی کا باعث تھے، عمومًا بحث کی جاتی تھی۔

دوعملی طرز کا یہ بے نظیر آئین، ہندوستان میں رائج کرکے اور ہندوستان کے بڑے صوبوں کو قدیم قسم کی جماعت عاملہ کے ساتھ حکومت خود اختیاری کا ایک حصہ شریک ہو جانے سے جو عام دلچسپی پیدا کر دی تھی، وہ اتنی زیادہ ہے کہ خوف ہے کہ طالب علم دستور ہند کی ایک ممتاز خصوصیت کو جو خاص اہمیت رکھتی ہے نظر انداز نہ کر دے۔ یہ خاص امتیاز ایک قسم کے وفاقی اصول پر، ہندوستان کی مرکزی اور صوبوں کی حکومتوں کو الگ کرتا ہے۔ اس تغیر کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ہم یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ۱۸۳۳ء سے اس وقت تک ہندوستان کا دستور العمل یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے، مکمل مرکزیت قائم رکھی جائے۔ ۱۷۷۳ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ کے ذریعہ بمبئی اور مدراس کے احاطوں کو جنگ یا صلح (یعنی امور خارجہ) کے معاملہ میں بنگال کے گورنر جنرل اور کونسل کے ماتحت کر دیا گیا تھا، لیکن اندرونی

[1] مقابلہ کرو۔ قواعد متعلق قانون (Rules under the Government of Inia Act) حکومت ہند ۱۹۱۹ء منتخب کمیٹی کی پہلی رپورٹ، فقرہ ۱۔

ملکی انتظام میں وہ بالکل آزاد تھیں۔ ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ (قانون منشوری) کے ذریعہ فورٹ ولیم بنگال کا گورنر جنرل، ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا گیا اور اس کی دفعہ ۳۹ کے ذریعہ یہ حکم دیا گیا کہ ہندوستان کے تمام مذکورہ علاقوں کے تمام ملکی فوجی اور مالی معاملات کی نگہداشت، ہدایت و اختیارات گورنر جنرل اور اس کی مجلس کے قبضے میں ہوں گے"۔ تم کو اس طرح نظر آئیگا کہ یہ قانون مال اور ملکی انتظام دونوں پر یکساں حاوی ہے، اور ۱۸۷۰ء تک جب سے کہ صوبے خود وسائل آمدنی پر حاوی ہو گئے وہ روپیہ جو مقامی حکومتیں خرچ کرتی تھیں، مرکزی خزانہ سے آتا تھا۔ اسی ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کے ذریعہ وہ اختیارات جو بمبئی اور مدراس کی مجالس مقننہ استعمال کرتی تھیں، ان کی حکومتوں سے لے لیئے گئے اور ۱۸۶۱ء کے قانون مجالس ہند کی منظوری تک برابر یہی صورت حال قائم رہی۔

قبل اس کے کہ ۱۹۱۹ء کی ترمیمات عالم وجود میں آئیں، قانون حکومت ہند کی ۱۹۱۵ء کی دفعہ ۳۳ کے مطابق حکومت ہند کو مندرجۂ ذیل اختیارات حاصل تھے۔

"حکومت ہند کے ملکی و فوجی انتظامات کی نگہداشت، ہدایات و اختیارات گورنر جنرل باجلاس کونسل کو دیئے گئے ہیں اور ان کے لئے لازمی ہے کہ وہ وزیر ہند کے ان تمام احکام کی جو وقتاً فوقتاً ان کو ملتے رہیں، پوری پوری اطاعت کریں"۔

"اسی طرح دفعہ ۴۵ حکومت ہند اور صوبوں کی حکومتوں کے تعلقات کو ظاہر کرتی ہے"۔

"ہر مقامی حکومت گورنر جنرل باجلاس کونسل کی کامل اطاعت کرے گی، اور اپنی تمام کارروائیوں یا ایسے معاملات سے، جن کی اطلاع ضروری ہو، یا جن چیزوں کے متعلق وہ اطلاعات حاصل کرنا چاہیئے ہمیشہ نہایت ہوشیاری سے اوس کو آگاہ رکھے گی، اور اپنے صوبہ کی حکومت کے تمام معاملہ میں، اس کی نگہداشت ہدایت و اختیارات کے ماتحت رہے گی"۔

ہندوستان جیسے وسیع ملک کی حکومت کی مرکزیت نظری حیثیت سے کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو، عملاً اس میں ترمیم کرنا ہی پڑتی ہے، اور وزیر ہند نے حکومت ہند کو اور حکومت ہند نے صوبوں کی حکومتوں کو بعض شرائط کے ماتحت جدید اخراجات کی منظوری کے متعلق جو اختیارات دے رکھے تھے اس کے علاوہ بہت سے تفصیلی معاملات میں (اور خصوصاً ۱۹۰۹ء کے ماموریہ شاہی متعلق اصول لامرکزیت Royal commission on Decentralization کے بعد سے) بہت کچھ آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں اسی لئے جب تک پارلیمنٹ کے قائم مقام کی حیثیت سے وزیر ہند حکومت ہند کے تمام معاملات کا ذمہ دار ہے اس وقت تک اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے حقوق ہر قسم کی مداخلت سے محفوظ رہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ جب تک برطانوی پارلیمنٹ وزیر ہند کو حکومت ہند کے تمام محکموں کے انتظام کا ذمہ دار سمجھتی رہے، اس وقت تک اسے اپنی اس ذمہ داری کے فرائض انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستانی معاملہ میں اس کے احکام ناطق ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ خواہ عام ہندوستانی رائے کا خیال کرے "یا کسی ایسے شخص کو جو موقع پر موجود ہو" اپنے اختیارات دیدے۔ ۱۹۰۸ء ہی سے جب کہ اصول لامرکزیت کی تحقیقات کے لئے شاہی ماموریہ مقرر ہوا تھا، حکومت ہند کی تمام تر توجہ اس لامرکزیت کے مسئلہ کی طرف مبذول رہی ہے۔ لارڈ ہارڈنگ نے وایسرائے ہونے کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور انھوں نے اپنے ۲۵ اگست ۱۹۱۱ء کے مراسلہ میں جو "مراسلہ دربار تاجپوشی" کے نام سے مشہور ہے، لکھا تھا کہ ان کے نزدیک اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ "صوبوں کی حکومت کو تدریجی طریقہ پر حکومت خود اختیاری دی جائے، یہانتک کہ ہندوستان کے ایسے صوبوں کا جو اپنے صوبہ واری انتظام میں خود مختار ہوں، ایک مجموعہ بن جائے، اور حکومت ہند ان سب کے اوپر ہو"۔ یہ حل دراصل ان اصلاحات سے جو عملی طور سے ۱۹۱۹ء میں عالم وجود میں آئیں، بہت زیادہ مشابہ ہے۔

ممکن تھا کہ آزادی صوبہ کے وہی معنی لئے جاتے، جو جان برائٹ نے ۱۸۵۸ء ہوا بتائے تھے، یعنی بڑے صوبے خود بلا واسطہ مرکزی حکومت ہند کے، پارلیمنٹ کے ماتحت ہوں، (۱) لیکن لارڈ ہارڈنگ کے دماغ میں جو خیال تھا وہ یقیناً یہ نہیں تھا۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ ایک مرکزی حکومت کا وجود ضروری ہے، صوبہ کی خود مختار حکومت کے بجز اس کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں، کہ پارلیمنٹ جو مرکزی حکومت کی نگہداشت کرتی ہے، صوبہ کے معاملات میں مداخلت کرنے سے باز رہے؟۔ اس کیساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پارلیمنٹ صوبوں کے معاملات میں دست بردار ہو تو آخر یہ دست برداری کس کے حق میں ہو گی؟۔ جب یہ مسئلہ حقیقۃً ایک اصولی مسئلہ کی حیثیت سے بالآخر زیر بحث آیا تو یہ صاف طور سے ظاہر ہو گیا کہ وسٹ منسٹر سے حکومت نہ کرنے کا واحد بدل صرف سوراج یا ہوم رول ہی ہو سکتا ہے۔

یہ مناسب معلوم ہوا کہ قانون (اصلاحات) ہند ۱۹۱۹ء کی پہلی دفعہ اور پہلی ذیلی دفعہ مندرجۂ ذیل چیزوں کے ذریعے سے قواعد کی ترتیب کے اصول قرار دیئے جائیں، چنانچہ قرار پایا کہ قواعد مفصلۂ ذیل کی رپورٹ شائع کیجائے۔

"(الف) مرکزی حکومت کے متعلق کون کون سے شعبے ہوں اور صوبوں کی حکومت سے متعلق کون کون سے، اور صوبہ کی حکومت اور صوبہ کی مجالس مقننہ کے کیا کیا فرائض ہوں اور گورنر جنرل کونسل میں اور مجلس مقننۂ ہند کے کیا کیا؟

(ب) صوبوں کی حکومتوں کو کن کن باتوں کا اختیار دیا جائے، اور اور مالگزاری اور دوسری آمدنیوں میں سے کون کون سے صوبوں کی آمدنیاں دی جائیں۔

(ج) ... اور (د) صوبوں کو جو شعبے متعلق کئے گئے ہیں ان میں سے کون کون سے شعبے جو اس قانون میں "شعبہ جات مفوضہ" کے نام سے موسوم ہیں) گورنر اور اس قانون کے ماتحت مقرر کردہ وزراء کے انتظام کرنے کے لئے دیئے جائیں، اور اس انتظام کے لئے مالگزاری یا آمدنی کا کونسا حصہ مخصوص کیا جائے۔؟

انتقالی قواعد کے ضمیمۂ اول کے حصۂ اول میں جس میں اس قانون کے عطا کردہ اختیارات کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے اس میں مرکزی محکموں کی ایک فہرست دی ہوئی ہے (یہ محکمے حکومت ہند اور مجالس مقننہ ہند سے متعلق ہیں) ان میں اہم ترین درج ذیل ہیں :-

(۱) مدافعت (پولیس کے علاوہ)۔

(۲) بیرونی اور خارجی امور۔

(۳) دیسی ریاستوں کے ساتھ تعلقات۔

(۴) ذرائع حمل ونقل (ٹریموے اور ہلکی ریلوں کے علاوہ) ڈاک اور تار۔

(۵) بڑے بڑے بندرگاہ: بحری باربرداری و جہاز رانی۔

(۶) زرمروجہ وتسکیک۔

(۷) قومی قرضہ، سیونگ بنک، مردم شماری، دیگر اعداد و شمار۔

(۸) تجارت وکمپنیاں: پیٹنٹ، حفاظت حقوق، اور معدنیات کا انتظام۔

(۹) چنگی، روئی پر محصول، محصول آمدنی، نمک۔

(۱۰) افیون کی زراعت اور تیاری اور برآمد کے لئے افیون کی فروخت۔

(۱۱) دیوانی و فوجداری قانون وضابطہ۔

(۱۲) تحقیقات کے لئے مرکزی مجالس و مدارس، بعض جامعات۔

(۱۳) ہندوستانی سول سروس، پبلک سروس کمیشن (امور یہ۔ ملازمت عام)

(۱۴) علاقوں کے حدود کی تبدیلی یا صوبہ کے ایسے معاملات کے لئے وضع قانون، جسے مرکزی جماعت مقننہ کے متعلق قرار دیا جائے۔

(۱۵) وہ تمام معاملات جن کا واضح طور سے صوبے کے ماتحت ہونے کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔

ضمیمۂ اول کے حصۂ دوم میں صوبوں کے محکموں کی فہرست ہے اور ضمیمۂ دوم میں محکمہ جات مفوضہ کی یعنی مؤخر الذکر محکموں ہی کے متعلق صوبوں کو کامل اختیارات دیئے گئے ہیں، انتقالی قواعد انتقال اختیارات کے حصہ ۵ میں مندرجۂ ذیل امور مندرج ہیں :-

"صوبہ کی مقامی حکومت پر گورنر کی نگہداشت، ہدایات اور نگرانی کے جو اختیارات گورنر جنرل باجلاس کونسل کو، اس قانون کے ذریعہ ملے ہیں، وہ شعبہ جات مفوضہ کے سلسلہ میں صرف مندرجۂ ذیل اغراض کے لئے استعمال کئے جائیں گے:-

"(۱) مرکزی محکموں کے مفاد کی حفاظت کے لئے -

(۲) جب دو صوبوں کے درمیان کوئی مسئلہ ما بہ النزاع ہو اور وہ اسے طے نہ کر سکیں تو اس کے فیصلہ کے لئے۔"

اس طرح ایک اور قاعدہ (اصلاح شدہ) قانون کی دفعہ ۳۳ کے ساتھ ساتھ وزیر ہند (یعنی خود پارلیمنٹ کے) اختیارات کو محدود کرتا ہے اور وزیر ہند کے اختیارات کے استعمال کے طریقہ کو بھی واضح کرتا ہے۔ وہ صرف مفصلۂ ذیل صورتوں میں مداخلت کرے گا:-

(۳) شہنشاہی مفاد کی حفاظت کے لئے۔

(۴) ہندوستان اور برطانوی حکومت کے دوسرے حصص میں جو مسائل پیدا ہوں ان میں حکومت ہند کے درجہ اور حیثیت کے مسائل پیدا ہونے پر حکومت ہند اور وزیر ہند کو اس بات کا بھی اختیار دیا گیا ہے کہ وہ تقررات یا صوبوں کے قرضوں کے متعلق جو معاہدے ہوں جس میں ہندوستان کا ہائی کمشنر یا وزیر ہند ایک فریق ہو ان کی تکمیل کرانے کے لئے مداخلت کر سکیں۔

ترویج اصلاحات کے تھوڑے ہی دنوں بعد دار العوام کے صدر کی ایک خاص کارروائی سے بہتر کوئی چیز بھی ان دستوری تبدیلیوں کی اصلی اہمیت کو نہیں بتا سکتی۔ پارلیمنٹ کے بعض ارکان نے جو معاملات ہند سے دلچسپی رکھتے ہیں، محکمہ جات مفوضہ کے متعلق بعض سوالات وزیر ہند سے کئے تو صدر دار العوام نے ان سوالات کو یہ بتاتے ہوئے مسترد کر دیا کہ دار العوام کے لئے یہ نہایت نامناسب ہے کہ وہ ایسے معاملات میں جو صوبوں کی مجالس مقننہ کے ماتحت ہیں دخل اندازی کرے[1]۔ مختصر یہ کہ صوبہ کی

---

[1] "مباحث دار العوام" ۲ مارچ ۱۹۲۱ء۔

خود مختاری اور پارلیمنٹ کی نگہداشت، دو جداگانہ چیزیں ہیں، اسلئے صدر نے صحیح طور سے کہا کہ محکمہ جات مفوضہ سے الگ رہو۔

مندرجۂ ذیل اہم تفویض کردہ محکمے ہیں:۔

(۱) منشیات اور نشہ آور ادویہ پر محصول آبکاری[ع۱]۔

(۲) مقامی حکومت خود اختیاری (مجالس بلدیہ مجالس اضلاع اور دوسری مقامی مجالس)۔

(۳) تعلیم (یوروپین اور اینگلو انڈین اقوام کی تعلیم کے علاوہ)۔

(۴) صفائی، حفظان صحت، اعداد و شمار متعلق پیدائش و موت۔

(۵) ہسپتال، شفاخانے، پاگل خانے، طبی تعلیم کا بندوبست۔

(۶) امور عامہ، مثلاً سڑکیں، عمارتیں، ہلکی ریلیں وغیرہ[ع۲]

(۷) صنعت و حرفت کی ترقی؛ اس میں تحقیقات اور صنعتی تعلیم کا بندوبست بھی شامل ہے۔

(۸) زراعت: اس میں تحقیقات، تجربات کا مظاہرہ اور تعلیم بھی شامل ہے۔

(۹) مویشیوں کے شفاخانے (۱۰) مجالس امداد باہمی۔

ان منتقل شدہ محکموں کے علاوہ صوبہ کی حکومتیں ان محکموں کا بھی انتظام کرتی ہیں، جو "شعبہ جات محفوظہ" کے نام سے موسوم ہیں، ان میں سے اہم ترین ذیل میں درج کئے گئے ہیں۔ ہم ان معاملات کو بھی جن میں صوبہ کی حکومتیں حکومت ہند کو مدد دیتی ہیں، محفوظ محکموں میں شریک کر سکتے ہیں مثلاً دیسی ریاستوں کے ساتھ تعلقات، اعداد و شمار، محصول آمدنی؛ یہ "مناصب" ایجنسی کہلاتے ہیں[ع۳]

ع۱۔ آسام میں نہیں۔

ع۲۔ دیکھو حصہ ۴ قواعد انتقالی۔

ع۳۔ صوبۂ بمبئی میں یہ ایک مستقل محکمہ ہے۔

(۱) قوانین اراضی و انتظام مالگزاری کی ہر ایک شاخ۔
(۲) امداد قحط۔
(۳) آبپاشی اور آبرسانی اور آبی قوت سے کام لینا۔
(۴) جنگلات۔
(۵) عدالتی انتظامات: اس میں تمام دیوانی و فوجداری عدالتیں شامل ہیں۔
(۶) پولیس اور قید خانے۔
(۷) کارخانجات وغیرہ ان کا معائنہ اور مزدوروں کے معاملات عموماً۔
(۸) کارہائے ایکسیں۔

مفوضہ اور محفوظ محکمے ملکر حکومت صوبہ بنتی ہے جہاں تک انتظامی معاملات کا تعلق ہے، وہاں تک بعض محکمے ایسے ہیں جو بالکل حکومت صوبہ کے ماتحت ہیں لیکن وضع قوانین کے لحاظ سے وہ مجالس مقننۂ ہند کے ماتحت ہیں، ان میں اہم ترین مندرجۂ ذیل ہیں:۔

(الف) آبپاشی اور آبی قوت کا استعمال اس حد تک جہاں تک کہ دوسرے صوبوں کا بھی اس سے تعلق ہے۔
(ب) عدالت عالیہ اور عدالتہائے فوجداری۔
(ج) قید خانے۔
(د) قوانین متعلق کارخانہ جات اور قوانین متعلق مزدوران عموماً۔
(ہ) جدید جامعوں کا قیام۔

ایسے محکموں کو انتظامی حیثیت سے تو حکومت صوبہ کے ماتحت اور وضع قوانین میں مرکزی مجالس مقننہ کے ماتحت اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کے متعلق تمام ہندوستان میں ایک ہی قسم کے قوانین ہونا مناسب سمجھا گیا۔ صوبوں کے ایسے دوسرے محکمے بھی ہیں (مثلاً متعدی امراض، امراض مویشی، تباہ کن کیڑے، یا دوسرے مہلک جانور اور امراض کے محکمے) جنہیں مجالس مقننہ ہند کے ماتحت رکھا جا سکتا ہے تاکہ تمام ہندوستان کے لئے یکساں قوانین بنائے جا سکیں۔

عـــ۱ ان معاملات میں اور اس حد تک صوبہ کی حکومتیں بھی قانون بنا سکتی ہیں، لیکن حکومت ہند سے منظوری لیکر۔

ان کے علاوہ ایسے قوانین کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے[1] جو تمام ہندوستان پر یکساں عائد ہو سکتے ہیں اور جن کے متعلق صوبوں کی مجالس مقننہ کو کوئی اختیار نہیں ہے اسی جگہ مجھ کو ایک اہم اور عجیب امتیاز کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔

گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنے کے بعد مجالس مقننۂ ہند اور صوبوں کی مجالس مقننہ ہر قسم کے قوانین منظور کر سکتی ہیں (البتہ ایسے قوانین جن سے پارلیمنٹ کے اختیارات پر یا برطانوی دستور کے غیر مکتوبی قوانین پر جن پر رعایا کی اطاعت یا تاج کی حکومت پر اثر پڑتا ہو وضع نہیں کئے جا سکتے) اسی طرح مجالس مقننہ ہند، حکومت ہند پر اور ہر مجلس مقننۂ صوبہ اپنے صوبہ کی حکومت پر نظری حیثیت سے وضع قوانین کے تمام اختیارات پر حاوی ہوتی ہے کیونکہ پہلے سے منظوری حاصل کر لینے کے بعد ایک مجلس مقننۂ صوبہ حکومت ہند کے محکموں اور مجالس مقننۂ ہند کے محکموں کے متعلق قانون سازی کر سکتی ہے[2]

تاہم یہ مخصوص اختیارات ہیں لیکن عام حالات کے اندر مجالس مقننۂ صوبجات صرف ان محکموں کے متعلق وضع قوانین کا حق رکھتی ہیں، جو انتقالی قواعد کے ماتحت الگ الگ ان کے لئے منقسم و مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔

صوبوں کو جو وفاقیہ نما مرتبہ دیا گیا ہے، ان کا اثر مالیات پر بھی پڑتا ہے سنہ ۱۸۶۱ء سے جو مسلسل تغیر و تبدل ہو رہا ہے، اس کا مقصد وحید یہ ہے

---

[1] منقول از قوانین (منظوری سابقہ) مقامی مجالس مقننہ۔

[2] قوانین وضع کرنے کے اختیارات مقامی اور مرکزی مجالس وضع قوانین کو ساتھ ساتھ حاصل ہیں، اس چیز کو بجنسہ بحال رکھنا اس وجہ سے مناسب سمجھا گیا کہ مرکزی و مقامی مجالس کے اختیارات کی تحدید از روئے قانون کرنے سے ایکٹوں کے جواز کی نسبت عدالتوں میں اس بنا پر بحث ہونے لگتی کہ جس مجلس نے ایکٹ وضع کیا ہے وہ اپنے حد اختیارات سے آگے بڑھ گئی۔ بحالت موجودہ اس قسم کی بحث پیدا ہونی ممکن نہیں کیونکہ ایک صوبہ کے ایکٹ کا جواز خارج از بحث فقط اس بنا پر ہو جاتا ہے کہ اس کی منظوری لازمی طور پر پہلے ہی گورنر جنرل سے حاصل کر لی گئی تھی بمقابلہ کرو اس شرطیہ عبارت سے جو (ریفارم) ایکٹ کی دفعہ ۱۰ (۴) میں مندرج ہے۔

کہ جس صورت سے بھی ہو، صوبوں کو آزاد ذرائع آمدنی پیدا کرنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن قانون ۱۹۱۹ء تک نہ تو صوبوں کو مستقل آزادانہ مالی آزادی دی گئی تھی اور نہ قانوناً ان کے اختیارات تسلیم کئے گئے تھے۔ یہ تبدیلی ۱۹۲۱ء کے موازنہ سے نظر آتی ہے۔ جب ۱۹۲۱ء کے بعد پہلی مرتبہ حکومت ہند کے آمد و خرچ سے صوبوں کا حساب الگ کیا گیا۔ مندرجۂ ذیل امور کے صوبوں کی طرف منتقل ہو جانے کی وجہ سے مالی خود مختاری کے ساتھ بعض نئی ذمہ داریاں پیدا ہو گئی ہیں (۱) آبرسانی کے کاموں کے لئے جو اب صوبہ سے متعلق ہو گئے ہیں، اخراجات کی ذمہ داری (۲) قحط کے لئے رقم محفوظ کا ہر سال جمع کرنا، (۳) صوبوں کے سابقہ قرضہ جسے صوبوں کو سالانہ بارہ قسطوں میں ادا کرنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں بعض جدید مراعات بھی حاصل ہوئی ہیں۔ صوبوں کی حکومتوں کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ صوبہ کی ضمانت پر ہندوستان کے اندر یا باہر حصول قرضہ کے متعلق گفتگو کر سکتی ہیں[1]۔ صوبوں کی مجالس مقننہ کو بھی اختیار دیا گیا ہے کہ مقامی مجالس مثلاً مجالس بلدیہ، مجالس اضلاع یا صوبوں کے دوسرے کاموں کے لئے خود جدید محصول لگا سکتی، یا لگانے کا اختیار دے سکتی ہیں۔ اس سے پہلے یہ اختیار حکومت ہند کی منظوری پر (جماعت عاملہ کے ذریعہ سے) انجام پا سکتا تھا۔ لیکن اسے کبھی بھی عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ اگر یہ نیا ٹیکس فہرست میں درج ہے تو اس کے لئے اول الذکر کی منظوری کی مطلق ضرورت نہیں ہے[2]۔

ہندوستانی مالیات کی مرکزی اور صوبوں کی حکومت میں جو تقسیم ہوئی ہے وہ اس تقسیم کے مطابق ہے جو محکموں کی مرکزی اور صوبہ داری حکومتوں میں کی گئی ہے

---

[1] قانون کی دفعہ (۱) وضع مقامی حکومت کے قوانین (قرضہ) جو اس دفعہ کے ماتحت بنائے گئے ہیں۔
[2] مقابلہ کرو قواعد متعلق محاصل۔

چنانچہ مندرجۂ ذیل آمدنی کے خاص مدوعنوانات ہیں :-

مرکزی	صوبہ
چُنگی	مالگزاری
محصول آمدنی	آبکاری (شراب و منشی ادویہ)
ریل	آب رسانی
ڈاک اور تار	جنگلات
نمک	ٹکٹ (عدالتی و غیر عدالتی)
برآمد افیون	فیس رجسٹری

تاہم اس واضح تقسیم میں دو مستثنیات کو مدنظر رکھنا چاہئے، ایک طرف تو یہ کہ کسی صوبہ کے محصول آمدنی کی رقم زیادتی کی وجہ سے جو رقم بڑھیگی، اس میں سے ۲۵ فیصدی رقم اس صوبہ کی حکومت کی ہوگی، دوسری طرف صوبوں کو مرکزی خزانہ کیلئے ایک رقم جو ابتدائً مجموعی حیثیت سے دس لاکھ پونڈ مقرر کی گئی تھی، دینا ہوگی۔ امید ہے کہ مرکزی حکومت کی آمدنی جوں جوں بڑھتی جائے گی، صوبہ پر سے یہ بار ہٹتا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ بھی طے پایا ہے کہ ضرورت کے وقت اس سے زیادہ رقم بھی صوبوں سے طلب کی جاسکتی ہے۔

صوبہ کے مفوضہ اور محفوظہ محکموں کے درمیان آمدنی کی، کس اصول پر تقسیم ہو، اس کا فیصلہ حکومت کا وہ حصہ جو محفوظ محکموں کے انتظام کا ذمہ دار ہے اور وہ حصہ جو محکمہ جات مفوضہ کا ذمہ دار ہے باہم کر لینگے [۱] اگر یہ حصہ جات حکومت اس قسم کا کوئی فیصلہ نہ کرسکیں تو خود گورنر اپنی سمجھ سے یا اس ثالث کے مشورہ کے مطابق جسے گورنر جنرل مقرر کرے صوبہ کی آمدنی

---

[۱] منقول از قاعدہ ۳۱ قواعد انتقالی۔

اور باقی رقم کو محفوظ اور منتقل محکموں میں تقسیم کردے گا اس تقسیم میں وہ ہر محکمہ کے لئے ایک مخصوص رقم مقرر کرے گا اور یہ تقسیم اس مجلس مقننہ کی بقا تک نافذ رہیگی[1] تفویض کردہ محکموں کے اخراجات اسی رقم سے جو ان کے لئے مقرر کی گئی ہو یا جو کسی خاص ٹیکس کی جو اسی غرض سے عائد کیا گیا ہو، پورے کئے جائیں گے اور ان کا تعین مجلس مقننہ کی رائے کے مطابق ہوگا (البتہ کسی ایسی جگہ کی تخلیق، تنسیخ یا تنخواہ پر نظر ثانی کا فیصلہ جس کا تقرر عموماً وزیر ہند کرتا ہے، یا ایسی ملازمت کا جس میں اسی قسم کے مشاہرے مروج ہوں وزیر ہند کی کونسل کی منظوری حاصل کرنے کے بعد ہوگا[1]) دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس قسم کے اخراجات پر وزیر ہند یا اجلاس کونسل یا مرکزی حکومت کو اختیار حاصل نہ ہوگا اور یہ صوبہ کی مالی خود مختاری کی ایک صورت ہے۔

مالی ذمہ داریوں کی روزافزوں ترقی کے ساتھ ہر صوبہ میں ایک مضبوط محکمۂ مالیات کے قیام کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ اس کا صدر گورنر کی جماعت عاملہ کا ایک رکن ہوگا اور اس کے ساتھ ایک معتمد مالیات بھی ہوگا اور اگر وزراء کی خواہش ہو تو ایک شریک معتمد بھی مقرر کیا جا سکتا ہے جس کے ذمہ یہ کام ہوگا کہ تفویض کردہ محکموں کے سلسلہ میں جو آمدنی و خرچ ہو اس کو خاص طور سے دیکھے اور وزراء جو محصول لگانے یا جدید قرضے لینے کی تجاویز پیش کریں ان پر غور کرے اور کارروائی کرے۔

(۳)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان کی ذمہ دارانہ حکومت کی بنیاد صرف ایک طرح کی وفاقی حکومت ہی ہو سکتی ہے، اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ یہ تدریجی طریقہ سے قائم کی گئی ہے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ہمہ گیر

---

[1] قواعد ۳۲ و ۳۳ از قواعد انتقالی۔

[2] حصہ ۳ قواعد انتقالی۔

مرکزی حکومت، صوبہ داری معاملات میں اپنے اختیارات سے دست بردار ہوگئی ہے۔ اب ہم کو یہ بتانا ہے کہ یہ انتقال اختیارات ابھی نامکمل ہے اور اس وقت تک نامکمل رہیگا کہ جب تک کہ صوبوں کے تمام معاملات ان خودمختار حکومتوں کے قبضہ میں نہ آجائیں گے۔ جو بڑے بڑے صوبوں میں قائم ہوچکی ہیں (اصلاح شدہ قانون حکومت ہند کی دفعہ ۳ (۱) میں اس کا یہ طریقہ رکھا گیا ہے کہ صوبوں میں سے "ہر ایک میں محفوظ محکموں کا انتظام گورنر باجلاس کونسل اور محکمہ جات مفوضہ کا انتظام (بجز ان حالات کے جن کی قانون میں تشریح کردی گئی ہو) گورنر اور وہ وزرا جو اس قانون کے ماتحت مقرر ہوں گے کریں گے۔

یہی وہ دوعملی[1] حکومت ہے جو جدید اصلاح کی ممتاز خصوصیت ہے۔ سوال یہ تھا کہ صوبوں میں عام اختیارات کو عمومی حکومتوں کی طرف عملاً اس طرح منتقل کردیا جائے، کہ اس سے ملکی انتظام میں کوئی نقص نہ واقع ہو ورنہ اس سے طرح طرح کی دقتیں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا ایسی صورت میں جو کچھ بھی کیا گیا، یہی اس مسئلہ کا واحد ممکن حل تھا۔

اگر ہم مفوضہ محکموں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ وزراء کو صوبہ کی حکومت میں واقعاً کیا حصہ ملا ہے حکومت کے جو احکام ان محکموں کے متعلق ہوں، ان کو حکومت صوبہ کے احکام سے بالکل ممتاز رہنا چاہئے[2]

[1] لفظ ڈیارکی (دوعملی حکومت) (Dyarchy) (یونانی duo = دو اور arche = حکومت) یہ اصطلاح مورخ موم سن کی وضع کی ہوئی ہے۔ رومن حکومت کے بعض صوبوں میں اس قسم کی دوعملی حکومت تھی اور مجلس سینات شہنشاہ کے ساتھ مشترکہ اختیارات استعمال کرتی تھی، اگرچہ di (یونانی dis = دوگونہ) وہ سابقہ ہے جو عموماً اس قسم کے الفاظ کی ساخت میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن عموماً اس لفظ کے ہجے (diarchy) سے زیادہ (dyarchy) رائج ہے۔ منقول از ڈیارکی مصنفہ کرٹس مقدمہ صفحہ ۳۲۔

[2] قانون کی دفعہ ۶ (۱)۔

گورنر کے مقابلہ میں وزرا کی جو دستوری حیثیت ہوگی اسے قانون کی دفعہ ۴۹ میں مندرجہ ذیل طریقہ پر بیان کیا گیا ہے :-

"(۱) ایک گورنری صوبہ کا گورنر ایک اعلان کے ذریعہ سے ایسے اشخاص کو جو اس کی مجلس عاملہ کے ارکان یا دوسرے حکام نہوں، اس غرض سے وزرا مقرر کر سکتا ہے کہ وہ تفویض کردہ محکموں کا انتظام کریں، اور اس طرح جو وزرا مقرر ہوں گے ان کا اپنے عہدوں پر قیام محض گورنر ہی کی خوشی پر منحصر ہوگا۔

(۲) جب تک کوئی شخص مجلس مقننہ کا منتخب رکن نہ ہو یا نہ ہو جائے اس وقت تک عہدۂ وزارت پر چھ مہینے سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔

(۳) تفویض کردہ محکموں میں گورنر وزرا کے مشوروں پر عمل کریگا، لیکن اگر اسے ان کی رائے سے اختلاف ضروری معلوم ہو تو وہ اس مشورہ کے خلاف جو کارروائی چاہے کر سکتا ہے"۔

اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ گورنر کو جماعت عاملہ صوبہ کے افسر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے یہ آئینی حق حاصل ہے کہ وہ وزرا کی رائے کو مسترد کردے، لیکن پھر بھی یہ ایک دوہرا اختیار ہے، کیونکہ وزراء کو بھی ایسے مواقع پر استعفا دیدینے کا حق ہے، اور اگر وزراء کو جن کا مجلس مقننہ کا رکن ہونا ضروری ہے، اس مجلس کی حمایت و تائید حاصل ہے تو گورنر کے لئے ایسے وزراء کا انتخاب، جن کو مجلس مقننہ میں اتنی تائید مل سکے کہ وہ ان محکموں کا انتظام کریں، اگر ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہوگا۔[1] تفویض کردہ محکموں کا انتظام اس اصول پر مبنی ہے، جسے اصطلاحاً "ذمہ دار حکومت" کہتے ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ جماعت عاملہ اس حیثیت سے مجلس مقننہ کے ماتحت ہو کہ اس کی تائید کے بغیر کوئی

[1] گورنر کو (بذریعہ دفعہ ۸ (۱) (الف قانون حکومت ہند) مجلس مقننہ کے برخاست کا عام حق حاصل ہے لیکن عملاً صورت حال پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا تاآنکہ موجودہ مجلس مقننہ اپنی پیشرو مجلس سے سیاستہً مختلف الاصول نہ ہو اور ایسی ہی حالت میں تبدیلی وزراء صحیح و قائم رہ سکتی ہے۔

حکومت قائم نہ رہ سکے[1]۔ نوآبادیات کے نظائر کے مطابق صوبوں کے گورنروں کی ہدایت کے لئے خود اعلیٰ حضرت ملک معظم کے دستخطوں سے جو ہدایت نامے شایع کئے گئے ہیں وہ اہم دستوری مسائل کے متعلق ہدایت کرتے ہیں کسی وزیر کے مشورہ پر غور کرتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ اس نے جو مشورہ دیا ہے اس سے اختلاف کیا جائے یا نہیں، گورنر کا فرض ہوگا کہ وہ اس تعلق کو جو وزیر کو مجلس مقننہ کے ساتھ ہے اور رائے عامہ کو جسے عوام کے نمائندے اس مجلس کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں، ملحوظ خاطر رکھے اس کے ساتھ ہی اس کا یہ بھی فرض ہوگا کہ اس بات کو بھی پیش نظر رکھے کہ کوئی حکم ایسا نافذ نہ ہوگا جس سے ان مختلف اغراض میں سے جو یہاں اختلاف اقوام، مذاہب تعلیم معاشرت، دولت یا کسی دوسری خاص حالت کی بنا پر موجود ہیں، کسی کو بھی کیا جائز فائدہ پہنچے، یا اسکی وجہ سے ان میں سے[2] کوئی کسی حق یا مراعات سے جس کا وہ اب تک مستحق تھا محروم ہو جائے۔ رہا اب یہ کہ اگر وزارت کا عہدہ عارضی طور پر پر کرنا ہو یا عمداً مزاحمت کے ذریعہ جو عام اختلال پیدا ہو جائے اس کو دور کرنا ہو تو ایسے حالات کے لئے یہ موقع دیا گیا ہے کہ ضرورت کے وقت گورنر اپنی استناد کے ذریعہ منتقل محکمہ کا انتظام اپنے ذمہ لے سکتا ہے[3]

جہاں ایک طرف تفویض کردہ محکموں کے وزراء مجلس مقننہ کے سامنے بلاواسطہ انفرادی حیثیت[4] سے ذمہ دار ہیں وہاں گورنر بہ اجلاس کونسل نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے محفوظ محکموں کے انتظام میں، جن میں صوبے کے

---

[1] منقول از نوٹ اف ریسپانسبل گورنمنٹ (ذمہ دارانہ حکومت) ماسبق۔

[2] منقول از ہدایت نامجات دفعہ ۶ و ۷ (الف)۔

[3] منقول از قواعد محکمہ جات مفوضہ (انتظام عارضی)

[4] وزراء کی اجتماعی ذمہ داری جو کابینہ کی ممتاز نشانی ہے، اصولاً تسلیم نہیں کی گئی ہے لیکن تمام دوسرے ممالک کی طرف ہندوستان کی پارلیمنٹی حکومت کا یہ ایک غیر مکتوبی قانون بن جائیگی۔

قیام امن و امان کو بنیادی شے قرار دینا چاہئے، پارلیمنٹ اور صرف پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہے، وزیر ہند جو پارلیمنٹ کا قائم مقام ہے گورنر جنرل یا جلاس کونسل کو مزید اختیارات دے سکتا ہے،" اور اسی طرح موخر الذکر گورنر یا جلاس کونسل کو" اور مقصد بھی یہی ہے کہ اس طرح اختیارات منتقل کئے جائیں[1]۔ لیکن اگر ذمہ داری کا طویل سلسلہ قائم رکھنا ہے تو اس سے کوئی انتقال اختیارات عمل میں نہیں آنا چاہئے اور حکومت ہند کا یہ رُخ تمام تر جیسا کہ ہونا چاہئے اور ہے سرتاپا یکساں ہونا چاہئے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گورنر باجلاس کونسل پر جو نئے فرائض عائد کئے گئے ہیں گورنر کو اس ذمہ داری کے مطابق اختیارات ملنے چاہئیں جو اسے محکمہ جات محفوظہ کی بابت حاصل ہیں۔ ہم اس معاملہ کو مفصلۂ ذیل نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ باضابطہ انتقال اختیارات کی وجہ سے اب مجلس مقننہ کو محکمہ جات مفوضہ کے بابت آخری فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہو گیا ہے، لیکن مجلس مقننہ کو اس بات کا کوئی دستوری حق حاصل نہیں ہے، کہ گورنر کو محفوظ محکموں کے متعلق عاملانہ حیثیت سے جو اختیارات حاصل ہیں، ان میں دخل اندازی کر سکے اس حیثیت سے گورنر کو مجلس مقننہ سے آزاد ہونا چاہئے، خواہ یہ کسی قانون وضع کرنے کا سوال ہو یا محفوظ محکموں کے متعلق انتظام کے لئے سرمایہ کا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے، کہ جہاں کہیں بھی وہ چاہے، وہ مجلس مقننہ کو اپنی بات منوائے، اور جب کبھی مناسب دیکھے اس کی رائے سے اتفاق کر لے۔

محفوظ محکموں کے انتظام کے متعلق گورنر کو جو خاص اختیارات دیئے گئے ہیں، ان میں اولین وہ اثباتی اختیار ہے، جو اسے ضابطہ استناد کے ذریعہ دیا گیا ہے یہ اختیار قانون اصلاحات کی دفعہ ۱۳ (۱) سے دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے:-

[1] یہ انتقال اختیارات عاملانہ احکام کی رو سے وجود میں آتا ہے اور اصولاً اصلی ذی اقتدار قوت کے اختیارات اس سے غیر متاثر رہتے ہیں اس قسم کا کوئی بھی تغیر اختیارات جو وزیر یا گورنر جنرل کی طرف سے عمل میں آئے گا تو وہ ہمیشہ دفعہ ۳۳ قانون ہند کی رو سے ہوگا۔

وجب کبھی کسی گورنر کی مجلس مقننہ، ایسے مسودہ کو جو کسی محفوظ محکمہ سے متعلق ہو پیش ہونے یا منظور ہونے سے روک دے، تو گورنر کو اس بات کی سند دینے کا اختیار ہے کہ اس مسودہ کی منظوری اس محکمہ کے فرائض کے انجام کے لئے بسا ضروری ہے، اس سند کے بعد، باوجود اس کے کہ مسودہ کو مجلس نے منظور نہ کیا ہو منظور شدہ تسلیم کر لیا جائیگا، اور گورنر کے دستخط کے بعد، خواہ اسی شکل میں جس میں کہ وہ پیش کیا گیا تھا یا مجلس مقننہ میں پیش کیا جانے والا تھا، یا (جو بھی صورت ہو) اس شکل میں جس میں کہ گورنر نے اسے مجلس کے سامنے پیش کئے جانے کی سفارش کی تھی، وہ مسودہ قانونی شکل اختیار کر لیگا۔

یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ اس قسم سے منظور شدہ قانون جماعت عاملہ کے ایک حکم مثلاً آرڈیننس[۱] یا احکام باجلاس کونسل سے مختلف ہے، کیونکہ اگر اس قانون کے پیش کرنے کی اجازت دیدی گئی ہوتی تو یہ پہلے مجلس مقننہ میں زیر بحث آتا اور بہت ممکن ہے کہ بحث و مباحثہ کی روشنی میں اس میں ترمیم بھی ہو جاتی۔ اگر گورنر جنرل اس قسم کا کوئی قانون منظور کرے تو فوری ضرورت کے علاوہ ہر دوسری حالت میں اسے حضور ملک معظم باجلاس کونسل کی منظوری کے لئے محفوظ رکھنا چاہیئے، اور ہر حالت میں اسے پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہونا چاہیئے، تاکہ وہ معاملات ہند کی موجودہ مشترک مجلس معاملات ہند کے ذریعہ اپنی رائے کا اظہار کر سکے، اگر اس نے ان کو منظور کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ برطانوی حکومت کی کامل منظوری بھی اسے حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں گورنر کو دوسرا اختیار مجلس مقننہ کے مقابلہ میں حق امتناع حاصل ہے۔ یہ حق اس اختیار سے علیحدہ ہے جو اسے کسی مسودہ کے مجلس مقننہ

---

[۱] یہ اختیار قانون حکومت ہند (دفعہ ۲ ۷ کے ماتحت حاصل ہے اور وہ یہ ہے) کہ فوری ضرورت کے وقت، برطانوی ہند، یا اس کے کسی حصہ کے قیام امن و بہتری حکومت کے لئے گورنر جنرل وقتی احکام نافذ کر سکتا ہے اور اس قسم کا وقتی حکم صرف چھ ماہ تک وہی قانونی درجہ رکھے گا، جو ہندوستان کی جماعت مقننہ کے منظور کردہ ایسے قوانین کو حاصل ہے۔

سے منظور رہو جانے کے بعد کسی مسودہ کو نامنظور کرنے کا ہے۔ یہ اختیار اسے قانون (اصلاحات) کی دفعہ ۱۱ (۴) کے ذریعہ دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے:

"جب کبھی کوئی مسودہ پیش کیا جائے، یا پیش کیا جانے والا ہو) تو اس حالت میں گورنر اس بات کی سند دے سکتا ہے کہ وہ مسودہ یا اسکی کوئی دفعہ یا ترمیم، اس کے صوبہ، اس کے صوبہ کے کسی حصہ یا کسی دوسرے صوبہ کے قیام امن وسکون کے منافی ہے، اور اس کے ساتھ ہدایت کرسکتا ہے، کہ مجلس مقننہ میں اس قسم کا مسودہ یا ترمیم کے متعلق کسی قسم کی بھی کوئی کارروائی نہ کیجائے اور اوس کی اس ہدایت پر عمل کیا جائے گا۔"

اسی طریقۂ استناد کے ذریعہ گورنر کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ کسی محفوظ محکمہ یا نہایت ہی فوری ضروری معاملات کے لئے مجلس مقننہ کی منظوری کے بغیر جس قدر رقم چاہے خرچ کرسکتا ہے۔ یہ اختیارات اسے قانون (اصلاحات) کی دفعہ ۱۱ (۲) کے ذریعہ دئے گئے ہیں، اور وہ یہ ہے:

"(الف) مقامی حکومت کو (منظوری رقم کے) مطالبہ کے سلسلہ میں اس بات کا حق ہوگا، کہ وہ اس طرح عمل کرے کہ گویا اسے اس کی منظوری مل چکی ہے، خواہ اوسے اس رقم کی منظوری نہ دی جائے، یا اس میں سے کچھ تخفیف کردی گئی ہو، مگر شرط یہ ہے کہ گورنر اس بات کی تصدیق کرے کہ یہ رقم اس محفوظ محکمے کے فرائض کے انجام کے لئے بسا ضروری ہے، اور (ب) فوری ضرورت کے وقت گورنر کو اس بات کا اختیار حاصل ہوگا کہ ایسی رقم کو جو صوبے کے قیام امن یا کسی محکمہ کے بقا کے لئے ضروری ہو خرچ کرنے کا اختیار دیدے۔"

تکرار سے بچنے کے لئے اس جگہ یہ بتادینا بے موقع نہ ہوگا کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل (یعنی حکومت ہند) کو جیسے مجلس مقننہ ہند سے وہی تعلق ہے، جو گورنر کو صوبہ واری مجلس مقننہ سے، وہ تمام اختیارات حاصل ہیں، جو استناد کے ذریعہ وجود میں لائے جاسکتے ہیں۔ طریقۂ کار میں صرف اسی قدر اختلاف ہے کہ چونکہ مجلس مقننہ ہند دو ایوانوں پر مشتمل ہے، اس لئے گورنر جنرل کو اپنے

انتہائی اختیارات کے استعمال میں اس بات کی کوشش کرنا پڑتی ہے، کہ اگر وہ دونوں ایوانوں کی نہیں تو کم از کم ایک کی منظوری ضرور حاصل کرلے، تاہم اسے اس بات کا اختیار ہے، کہ اگر دونوں ایوانوں میں سے کوئی بھی اس کے ایک مسودہ کو منظور نہ کرے، پھر بھی وہ صرف پیش کرنے کے بعد ہی اسے منظور کرسکتا ہے (بشرطیکہ اس کے پیش کئے جانے کی اجازت سے انکار نہ کر دیا گیا ہو)۔

صوبہ واری حکومت کی دو مختلف شاخوں کی طرف متوجہ ہوتے وقت ہم کو یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ اگرچہ ان دونوں میں سے ہر ایک کے اختیارات اور ذمہ داریاں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں یعنی ان میں سے ایک کامل طریقہ سے عمومیت وعام پسند اصول کو پیش کرتی ہے، اور دوسری (اپنی انتہائی حالت میں) استبدادیت کو، اور اگرچہ اسی بناپر دونوں اپنے فرائض کے انجام میں الگ الگ مصروف کار ہیں، لیکن پھر بھی ان کو بعض معاملات میں خصوصاً مالیات میں، تبادلۂ خیالات کرنا ہی پڑتا ہے، اور اس بناپر گورنر پر اس کے ہدایت ناموں میں لازمی قرار دیا گیا ہے کہ :-

"(۴) تم اپنے اپنے ارکان کونسل اور اپنے وزرا کے باہمی مشاورت کی عادت کو بڑھانے کی کوشش کروگے، تاکہ تمہارے سرکاری مشیروں کے تجربات سے وزراء مستفید ہوسکیں، اور اس کے ساتھ تمہارے ارکان کونسل کو وزرا سے یہ معلوم ہوسکے کہ عوام کی کیا خواہش ہے۔"

آؤ اب ہم اپنے سامنے صوبوی حکومت کی ایک تصویر کھینچیں۔ جماعت عاملہ کا افسر اعلیٰ گورنر تینوں احاطوں یعنی مدراس بمبئی اور بنگال کے لئے ایسے اشخاص میں سے منتخب کیا جاتا ہے، جو انگلستان کی قومی زندگی میں امتیاز حاصل کرچکا ہو، (اور عموماً وہ کوئی نہ کوئی لارڈ ہوتا ہے، اور باقی صوبوں کے لئے عموماً ان لوگوں میں سے منتخب ہوتا ہے، جو انڈین سول سروس کے انتہائی مدارج تک پہنچ چکے ہوتے ہیں[۱]۔ لارڈ سنہا آف رائے پور جو ہندوستان

[۱] اصولی فرق یہ ہے، کہ موخر الذکر کا تقرر گورنر جنرل سے استصواب رائے کے بعد ہوتا ہے

اور انگلستان دونوں جگہوں میں ممتاز عہدوں پر رہ چکے تھے، انڈین سول سروس کے رکن نہ ہونے کے باوجود، بہار و اڑلیسہ کے پہلے گورنر بنائے گئے۔ گورنر کی کونسل یوں تو اصولاً ایک سرکاری رکن (جو انڈین سول سروس کا سینیر رکن) اور ایک غیر سرکاری رکن پر (جس نے ہندوستان کی عام زندگی میں خاص شہرت حاصل کی ہو) مشتمل ہوتی ہے لیکن بعض جگہوں میں دو سرکاری اور دو غیر سرکاری ارکان بھی ہوتے ہیں[ا] یہ شاخ عموماً گورنر باجلاس کونسل نہ کہ گورنر مع کونسل کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ ارکان اجتماعی حیثیت سے حکومت کے مترادف ہیں، لیکن گورنر کو ان کی رائے کے استرداد کا آئینی حق حاصل ہے[۲]۔
اب حکومت کی اس دوسری شاخ کی طرف متوجہ ہو، جو محکمہ جات مفوضہ کا انتظام کرتی ہے۔ یہ شاخ عموماً دو اور بعض صوبوں میں تین وزرا پر مشتمل ہوتی ہے؛ یہ وزرا جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، مقامی مجلس مقننہ کے منتخب ارکان یعنی صوبہ کے ممتاز سیاسی رہنما ہوتے ہیں۔ وزرا کو وہی مراعات و مراتب اور عموماً وہی تنخواہ ملتی ہے جو ارکان کونسل کو[۳] ارکان کونسل اور وزراء کے محکموں کی تقسیم میں مختلف صوبوں میں اختلاف ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) (منقول از دفعہ ۴۶ قانون) تمام گورنروں اور گورنر کی کونسل کے ارکان کا تقرر براہ راست شاہی مہر تصدیق (رائل سائن مینول) کے ذریعہ خود ملک معظم کی جانب سے عمل میں آتا ہے۔

[ا] آئینی حد چار کی ہے، جن میں سے کم از کم ایک ایسا ضرور ہونا چاہئے کہ جس نے اس تقرر کے وقت تک ہندوستان میں حکومت کی بارہ سال تک ملازمت کی ہو منقول از دفعہ ۴۷ (مطابق ترمیم) قانون حکومت ہند۔

[۲] مقابلہ کرو ما سبق باب ۲۔

[۳] قانون دفعہ ۴ (۱) میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ جب تک مقامی مجلس مقننہ کوئی کمتر رقم منظور نہ کرے وزرا کی تنخواہ وہی ہوگی جو مجلس عاملہ کے ارکان کی ہر ایک مجلس میں اس بات پر گرم بحث ہوئی لیکن صرف ایک صوبہ یعنی صوبۂ متوسط میں (جہاں وزرا کی تنخواہ ۲ ہزار مقرر کی گئی، حالانکہ ارکان مجلس عاملہ کی ۴ ہزار ہے) کم تنخواہ مقرر ہوئی اس مسئلہ میں ہمیشہ وزراء کے وقار کا سوال پیش نظر رکھا گیا ہے۔

ان ملکی ملازموں کے متعلق جو دوعملی حکومت کے ماتحت کام کرتے ہوں، یہ طے پایا کہ وہ حکام جو مفوضہ محکموں میں کام کرتے ہوں وزراء کے ماتحت ہونگے اور جو دوسرے محکموں میں ہوں، وہ گورنر باجلاس کونسل کے ماتحت ہوں گے البتہ وہ شخص جو مفوضہ اور محفوظہ دونوں محکموں کے فرائض انجام دیتا ہو (اور اکثر ایسا ہوتا ہے) تو وہ گورنر کے فیصلہ کے مطابق یا تو وزراء کے ماتحت ہوگا یا گورنر باجلاس کونسل کے۔ ان سرکاری حکام کے مفاد کی حفاظت کے لئے جو نئے افسروں کے ماتحت کام کریں یہ قرار پایا ہے کہ[۱] کسی ایک ایسے افسر کے جسے وزیر ہند نے ہندوستانی ملازمت کے لئے مقرر کیا ہو یا کسی ایسے افسر کے جسے گورنر نے صوبوی ملازمت کے لئے مقرر کیا ہو، تنخواہ یا تنبیہ کے متعلق کوئی کارروائی اس وقت تک نہیں کی جاسکتی، جب تک کہ خود گورنر کی ذاتی منظوری اس کے لئے حاصل نہ کر لی جائے ایک عام ہندوستانی ملازمت کے رکن کو اس بات کا حق ہے، کہ اگر وہ سمجھے اس کی کسی نہ کسی صورت سے کسی افسر اعلیٰ نے حق تلفی کی ہے تو اس کے احکام کے خلاف مرافعہ گورنر کے یہاں کرے، اس کا گورنر کی منظوری کے بغیر کسی جگہ تقرر نہیں کیا جا سکتا، اور اپنے تقرر کنندہ کے حکم کے بعد موقوف نہیں کیا جا سکتا۔

اب صرف یہ بتانا رہ جاتا ہے کہ یہ دوعملی ایک وقتی صورت ہے، اور وہ صرف اس وقت تک قائم رہیگی، جب تک یہاں سوراجی حکومت مستحکم نہ ہو جائے۔ جب اس کا تیقن ہو جائے گا تو پارلیمنٹ کا اختیار جو گورنر کی

---

[۱] منقول از دفعہ ۳۶ (۱)، اور قواعد ۱۰ و ۱۱ من قواعد انتقال اختیارات مجلس مشترکہ معاملات ہند حکومت ہند کے مسودہ (اصلاحات) پر رائے زنی کرتے ہوئے دفعہ ۳۶ میں سفارش کرتی ہے، کہ جو حکام ان جدید حالات کو ناقابل قبول سمجھیں، ان کے لئے دوسرے عہدے مہیا کیئے جائیں یا ان کو ان کے ایام ملازمت کے لحاظ سے پنشن لے کر الگ ہو جانے کی اجازت دیدی جائے تناسب ایام ملازمت کے حساب سے پنشن لینے کے اصول اس کے بعد شائع کئے جا چکے ہیں۔

وساطت سے قائم ہے ہٹا لیا جائے گا اور مقامی حکومت ایک متحدہ و متفقہ حکومت ہو جائیگی جو ایک گورنر اور ذمہ دار وزرا پر مشتمل ہوگی۔ اس اسکیم کی ما بہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اگر پارلیمنٹ دیکھے کہ وزرا نے اپنے فرائض اچھی طرح سے انجام دیئے ہیں، تو قوانین انتقال اختیارات کی ترمیم کے بعد، ان کو صوبائی حکومت کے انتظام میں مزید حصہ دے سکتی ہے، اور اگر وہ دیکھے کہ کاروبار بالکل مختل ہو گیا ہے، تو عطا کردہ محکموں کی فہرست سے بھی بہت سے محکمے کم کر سکتی ہے۔ اس طرح پارلیمنٹی اصول پر صوبوں کی کامل آزادی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور ترقی کا انحصار تمام تر نتائج کی کامیابی پر ہے خود قانون (اصلاحات) کے حصہ ۵ میں یہ قرار پا گیا ہے کہ اس قانون کے منظور ہو جانے سے دس سال بعد، پارلیمنٹ کی طرف سے ایک آئینی ماموریہ اس غرض سے مقرر کیا جائے کہ وہ اس نظام حکومت کے عمل، تعلیم کی ترقی اور برطانوی ہند میں نیابتی ادارات کی توسیع کے متعلق تحقیقات کر کے بتائے کہ کہاں تک اور کب تک ذمہ دارانہ حکومت کے اصول کو ترویج دی جا سکتی ہے، یا کس درجہ تک موجودہ ذمہ دارانہ حکومت کی توسیع، ترمیم یا تحدید کی جا سکتی ہے۔

(۴)

دفعہ ۷ قانون (اصلاحات) قواعد متعلق انتخاب مجالس مقننہ صوبجات اور دفعہ ۲۳ قواعد متعلق انتخابات مجلس مقننۂ ہند کے ماتحت جو قواعد وضع کئے گئے ہیں اور اس قانون کے ذریعہ قائم کردہ حدود کے اندر مفصلۂ ذیل امور کی صراحت کرتے ہیں۔ مختلف مجالس مقننہ کی ترتیب، حلقہ جات رائے دہندگان کا تقرر، رائے دہندوں، اور امیدواروں کے لئے شرائط کا انضباط، انتخاب کے لئے کام کرنے والوں کا انتظام، اخراجات انتخابات[1]، خلاف قانون کارروائیوں کی روک تھام[2] اور انتخابی درخواستوں کا فیصلہ۔

قانون (اصلاحات) کی دفعات کے ماتحت مجلس مقننۂ ہند، گورنر جنرل اور دو ایوانوں پر مشتمل ہوتی ہے یعنی کونسل آف اسٹیٹ (مجلس مملکت) اور جمعیت مقننہ (دفعہ ۱۷)۔ مجلس مملکت میں زیادہ سے زیادہ ۶۰ ارکان ہوتے ہیں، ان میں ایک ثلث سے زیادہ سرکاری ارکان نہیں ہوتے (دفعہ ۱۸)۔ جمعیت مقننہ میں کم از کم ۱۴۰ ارکان ہوتے ہیں، اور نامزد شدہ ارکان میں ⅓ سے زیادہ سرکاری عہدہ دار نہیں ہوتے (دفعہ ۱۹)۔ گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے تمام ارکان خواہ مجلس مملکت کے، خواہ جمعیت مقننہ کے، سرکاری نامزد شدہ ارکان ہوتے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے وزراء کی طرح اگرچہ وہ ایک ہی ایوان کے رکن کیوں نہ ہوں، لیکن انھیں دونوں ایوانوں کی شرکت اور ان میں تقریر کا حق حاصل ہے۔

---

[1] حکومت ہند کو (قواعد انتخاب کے قاعدہ ۱۸ کے ماتحت) یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ انتخابات کے انتہائی اخراجات کو مقرر کر دے جو ممکن ہے کہ پہلے تجربہ کے بعد مختلف حلقوں میں مختلف ہو، اور اس کے ساتھ یہ اختیار بھی ہے کہ تنخواہ دار کارکنوں کی تعداد بھی محدود کر دے۔

[2] انتخابات کے سلسلہ میں خلاف قانون کارروائیاں تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹ ۱۹۲۰ء کے ماتحت آجاتی ہیں۔

مجلس مقننہ ہند کے قواعد انتخاب کے قاعدہ ۳ کے ماتحت دونوں ایوانوں کی ترتیب اس طرح کی گئی ہے:۔

	مجلس مملکت	جمعیت مقننہ
منتخب شدہ ارکان	۳۴	۱۰۴
سرکاری ارکان	۲۰ [ع۱]	۲۶ [ع۱]
دوسرے نامزد کردہ ارکان	۶	۱۴
میزان	۶۰	۱۴۴

آؤ اب صوبوں کی مجالس کی طرف متوجہ ہوں۔ ان کے متعلقہ قانون (اصلاحات) کی دفعہ ۷ (۱) و (۲) میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر ایک صوبہ میں جہاں کا افسر اعلیٰ گورنر ہو، ایک مجلس مقننہ ہوگی جن میں ارکان کی کم سے کم تعداد مفصلۂ ذیل ہوگی۔ ان ارکان میں سے ۷۰ فی صدی منتخب ہوں گے اور باقی ارکان میں ۲۰ فی صدی سے زیادہ سرکاری عہدہ دار نہ ہوں گے، (ان میں گورنر کی مجلس عاملہ کے ارکان بھی شریک ہیں)۔ قواعد انتخاب کے قاعدہ (۲) کے ماتحت ہر صوبہ کی مجلس مقننہ مندرجۂ ذیل تعداد کے ارکان پر مشتمل ہوگی:۔

	مدراس	بمبئی	بنگال	صوبجات متحدہ	پنجاب	بہار و اڑیسہ	صوبجات متوسط و برار	آسام
منتخب شدہ ارکان	۹۸	۸۶	۱۱۳	۱۰۰	۷۱	۷۶	۵۳	۳۹
سرکاری ارکان	۱۹ [ع۱]	۱۶ [ع۲]	۱۸ [ع۲]	۱۶ [ع۳]	۱۴ [ع۱]	۱۸ [ع۲]	۸ [ع۲]	۷ [ع۲]
دوسرے نامزد کردہ ارکان	۱۰	۹	۸	۷	۸	۹	۹	۷
میزان	۱۲۷	۱۱۱	۱۳۹	۱۲۳	۹۳	۱۰۳	۷۰	۵۳
کم از کم قانونی تعداد	۱۱۸	۱۱۱	۱۲۵	۱۱۸	۸۳	۹۸	۷۰	۵۳

ع۱ اس میں صدر بھی شامل ہے۔ مجلس مملکت میں یہ تعداد انتہائی ہے۔ اگر سرکاری عہدہ داروں کی پوری تعداد نامزد کی گئی ہو تو غیر سرکاری نامزد شدہ ارکان کی تعداد اسی تناسب سے بڑھادی جائیگی۔ لیکن ایوان مقننہ کے سرکاری عہدہ دار ارکان کی تعداد آئینی حیثیت سے مقرر ہے۔

ع۲ ان میں ارکان باعتبار عہدہ شامل نہیں ہیں۔ ان کی تعداد ۲ سے ۴ تک ہوتی ہے، اور اگر سرکاری عہدہ داروں کی پوری تعداد کو نامزد کر دیا جائے تو اسی تعداد سے غیر سرکاری نامزد شدہ ارکان کی تعداد گھٹانا پڑیگی (ان ارکان کا باعتبار عہدہ لحاظ رکھتے ہوئے) اگر سرکاری عہدہ داروں کی پوری تعداد نامزد نہیں کی گئی تو موخر الذکر تعداد کو اسی تناسب سے بڑھادی جائیگی چنانچہ مدراس میں ایسا ہی کیا گیا ہے۔

گورنر کو اس بات کا بھی اختیار ہے کہ وہ کسی اہم قانون کے وضع کرنے کے سلسلہ میں عام ارکان مجلس مقننہ کے علاوہ دو اور ارکان کو بھی لیکن آسام میں صرف ایک کو نامزد کرسکتا ہے، اور ان دو ارکان کو اس خاص کام کے اختتام تک عام ارکان کی طرح تمام حقوق حاصل ہوں گے (دفعہ ۷ (۳) (ب)۔ اس کے ساتھ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ یہ ممبر ارکان سرکاری عہدہ دار ہی ہوں۔

ایک دوسرے سے ممتاز تین طریقۂ انتخاب رائج ہیں۔ ایک صوبہ واری جو مقامی مجلس مقننہ کے متعلق ہے، اور دوسرا اور تیسرا تمام ہندوستان سے متعلق جماعت مقننہ اور مجلس مملکت کے متعلق ہر طریقۂ انتخاب میں (الف) عام و (ب) خاص حلقہائے انتخاب ہوتے ہیں۔ عام حلقہائے انتخاب میں کسی رائے دہندہ کے لئے جو شرائط ہیں، وہ مختلف صوبوں ہی میں مختلف نہیں ہیں، بلکہ ایک صوبہ کے مختلف صیغوں میں بھی مختلف ہوتی ہیں، اور مختلف اقسام رائے دہندگان کے مطابق ان کے مدارج بھی مختلف ہیں لیکن ایک ہی صوبہ یا کسی صوبہ کے جزو کے اندر ایک ہی طریقۂ انتخاب کے ماتحت عام حلقۂ انتخاب کے شرائط تقریباً تمام تر یکساں ہیں۔ منسلکہ نقشہ، شرائط انتخاب کا ایک تخیل تمھارے سامنے پیش کرسکے گا۔

ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل کو بھی مجلس مقننہ کے لئے رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ ہندوستانی فوج کے تمام پنشن یافتہ علیحدہ شدہ افسر و سپاہی اور صوبجات متوسطہ اور پنجاب میں نمبردار یا گانوں کا مکھیا۔ مجلس مملکت کے لئے مندرجۂ ذیل کو بھی رائے دینے کا حق حاصل ہے:۔ وہ اشخاص جو کسی گزشتہ یا موجودہ مجلس مقننہ کے رکن تھے یا ہیں، وہ اشخاص جو کسی مجلس بلدیہ، یا مجلس ضلع یا مینک امداد باہمی کے صدر یا نائب صدر رہے یا ہیں، وہ اشخاص جو کسی جامعہ کی مجلس رفقا کے رکن تھے یا ہیں، یا وہ اشخاص جن کو مشرقی علوم کی اعلیٰ ترین سند حاصل ہوئی

لہ جونکہ مجلس مملکت تمام قوانین ہند کے لئے ایک نظر ثانی کرنے والی مجلس ہوگی اس لئے ہم اس کے لئے ملک کے بہترین قابل حصول اشخاص کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اس مجلس میں دیرینہ سال تجربہ کار مدبرین کی شان وقار کا رنگ جھلکتا ہو، اس لئے ہماری تجویز ہے کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل اس کی امیدواری کی حق کے لئے

۱ - تمام رائے دہندگان :- ۲۱ سال سے اوپر کے برطانوی مرد رعایا[1] اور[2]

۲ - شہری حلقہائے انتخاب :-	مقامی مجلس مقننہ	جمعیت مقننہ	مجلس مملکت	
(۱) اس حلقہ انتخاب میں ۱۲ ماہ تک سکونت رکھنے والے - اور				
(۲) یا تو الف محصول بلدیہ کا دینے والا جو قانونا -	۳ روپیہ سالانہ[2]	۲۰-۱۵ روپیہ سالانہ	-	سے کم نہ ہو
یا ب ایسے گھر کا مالک یا قابض جس کا سالانہ کرایہ قانونا -	۳۶ روپیہ[3]	۱۸۰ روپیہ		سے کم نہ ہو
یا ج جس کی سالانہ آمدنی پر انکم ٹیکس لگایا جاتا ہو، یہ آمدنی	۲۰۰۰ روپیہ	۵۰۰۰-۲۰۰۰ روپیہ	۲۰۰۰۰-۱۰۰۰۰ روپیہ[4]	سے کم نہ ہو
۳ - دیہاتی حلقہائے انتخاب :- کسی ایسے قابل زراعت تختہ اراضی کا مالک ہونا جس کا لگان قانونا سالانہ -	۵۰-۱۰ روپیہ	۱۵۰-۵۰ روپیہ[5]	۲۰۰۰-۱۵۰۰ روپیہ	سے کم نہ ہو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :- ایسے قوانین وضع کریگا، جو اس بات کے ضامن ہونگے، کہ ان اشخاص کا رتبہ، درجہ، اور گزشتہ خدمات اس مجلس کو ایک مجلس سینات کی شکل دیگی اور اس میں ایسے اوصاف موجود ہوں گے، جو ایک نظر ثانی کرنے والی مجلس کے لئے ضروری ہیں، (جائینٹ رپورٹ پارہ ۲۷۸)

[1] ہندوستانی ریاستوں کی رعایا کے افراد میں اگر مطلوبہ شرطیں موجود ہوں تو مقامی حکومت کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت ان کو رائے دینے کا حق حاصل ہو سکتا ہے (دفعہ ، (۱) قواعد انتخاب۔

[2] عورتوں (یا عورتوں کی جماعت) کو مجلس مقننہ متعلقہ کی قرار داد کے بعد بشرط موجودگی شرائط مطلوبہ رائے دینے کا حق ملسکتا ہے لیکن ہر صوبہ میں ان کی مرکزی مجلس مقننہ کے لئے رائے دینے کا حق اس بات پر منحصر ہے کہ انکو اپنے صوبہ کی مجلس مقننہ کے لئے رائے دینے کا حق مل گیا ہو (قاعدہ ۷، (۱) قواعد انتخاب) اس قسم کی جنسی رکاوٹ کو دور کرنے کی تجاویز تقریباً ہر مقامی مجلس مقننہ میں اور ایوان مقننہ میں منظور ہو چکی ہیں۔

[3] کلکتہ، مدراس، بمبئی، اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں یہ رقم اس سے کہیں زیادہ ہے۔

[4] مسلمانوں کے داخلہ کے لئے بنگال، بہار، اڑیسہ میں بہت کم رقم رکھی گئی ہے۔

[5] ہر صوبہ (یا ہر جزو صوبہ) میں نوعیت قبضہ کے اعتبار سے رقم کی کمی و زیادتی میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے

جیسا کہ مندرجۂ ذیل نقشہ سے پتہ چلیگا، عام حلقۂ انتخاب کو پھر فرقہ وارانہ شاخوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ پنجاب میں عام حلقہائے انتخاب سے ۶۴ ارکان منتخب ہوتے ہیں، ان میں سے ۱۲ ارکان سکھوں کے شہری و دیہی حلقہائے انتخاب سے آتے ہیں۔ بنگال میں عام یوروپی حلقہائے انتخاب سے ۵، اور باقی جگہوں سے ایک یا دو ارکان آتے ہیں لیکن اصلی تقسیم مسلم اور غیر مسلم حلقہائے انتخاب کی ہے۔ اس تقسیم کی بنا کانگرس و لیگ کے معاہدہ[1] پر ہے اس معاہدہ کے ذریعہ مسلمانوں کو تمام مقامی مجالس مقننہ اور دونوں مرکزی ایوانوں میں اکثر صوبوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ نشستیں دی گئی ہیں۔ مدراس ۶۵ غیر مسلم نشستوں میں سے ۲۸ غیر برہمنوں کے لئے مخصوص ہیں[2] مگر اس کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ نشستیں، جن حلقوں کے لئے مخصوص کی گئی ہیں، ان کے لئے امیدوار بھی موجود ہوں اسی طرح صوبۂ بمبئی کی ۴۶ غیر مسلم جگہوں میں ۷ مرہٹوں کے لئے مخصوص ہیں۔

عام حلقہائے انتخاب

(۱) مسلم۔ صوبجات متوسط کے انتخاب برائے مجلس مملکت کے سوا ہر قسم کے انتخاب کے لئے۔

(۲) غیر مسلم۔

(۳) سکھ۔ پنجاب میں ہر قسم کے انتخاب کے لئے۔

(۴) یوروپی۔ پنجاب اور صوبجات متوسط کے علاوہ تمام مجالس مقننہ اور جمعیت مقننہ کے ہر قسم کے ہر صوبہ سے انتخاب کے لئے۔

(۵) اینگلو انڈین۔ (یعنی مخلوط النسل کے افراد) مدراس کی مجلس مقننہ کے لئے (ایک نشست) اور بنگال میں (دو نشستیں)

---

[1] یعنی لکھنو کا سنہ ۱۹۱۶ء کا معاہدہ، جبکہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس میں متفقہ طور سے اس بات کو طے کیا کہ اصلاح شدہ مجالس میں مسلمانوں کو کسی تناسب سے نشستیں دی جائیں

[2] مقابلہ کرو۔ جو کچھ بھی مدراس برہمن اور غیر برہمن کے متعلق باب ۱ (۳)۔

(۶) ہندوستانی عیسائی۔ مدراس کی مقامی مجلس مقننہ کے لئے (پانچ نشستیں)
ان عام حلقہائے انتخاب کے علاوہ بعض خاص حلقہائے انتخاب بھی ہیں،
ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔ بڑے بڑے زمیندار مقامی مجالس مقننہ میں ۴
سے ۶ تک ارکان بھیجتے ہیں، اور مختلف تجارتی و صنعتی جماعتیں (مثلاً ایوان ہائے
تجارت، مجلس کارخانجات، مجالس تجارت، انجمن مزارعین، و انجمن معدنیات) چھوٹے
صوبوں کی مجالس مقننہ میں ۲ سے ۳ تک اور بڑے صوبوں میں ۶ سے ۷ تک
(بنگال میں ۱۵) ارکان بھیجتی ہیں۔ مجموعی حیثیت سے ان تمام جماعتوں سے ملا کر
چھوٹے صوبوں میں ۶ سے ۹ تک اور بڑے صوبوں میں ۱۱ سے ۱۳ ارکان
تک مقامی مجلس مقننہ کے لئے چنے جاتے ہیں۔ (صرف بنگال میں ۲۱) کوئی
رائے دہندہ (بشرط موجودگی جمیع شرائط) ایک سے زیادہ عام حلقہا ئے
انتخاب میں اپنے کو درج نہیں کرا سکتا، لیکن وہ کسی عام حلقۂ انتخاب کے علاوہ
کسی خاص حلقۂ انتخاب میں بھی اپنا نام مندرج کرا سکتا ہے۔

خاص حلقہائے انتخاب:۔

(۷) بڑے زمیندار۔ آسام کے سوا تمام مقامی مجالس مقننہ کیلئے اور بمبئی اور
آسام کے سوا جمعیت مقننہ کے لئے۔

(۸) جامعہ۔ آسام کے سوا ہر صوبہ میں مقامی مجلس مقننہ کے لئے
(ایک نشست)۔

(۹) صنعتی و تجارتی مفاد۔ تمام صوبوں کی مجلس مقننہ کے لئے، مدراس اور
بمبئی میں جمعیت مقننہ کے لئے اور بنگال اور بمبئی میں مجلس مملکت کے لئے۔

کسی ایسے شخص کو جس کا نام کسی خاص حلقۂ انتخاب کے رائے دہندوں
میں درج نہ ہو، اس خاص حلقۂ انتخاب کی طرف سے امیدوار ہونے کا حق نہیں
ہے، کسی شخص کو کسی عام حلقہ کی طرف سے امیدوار ہونے کا اس وقت تک
حق نہیں جب تک اس کے نام کا اندراج ہے عام حلقہ میں یا کسی دوسرے عام حلقہ میں
مندرج نہ ہو جائے۔ اس شخص کو اس مذہب کا ہونا چاہیئے، جس کی وہ نیابت کرتا ہے[۱]

[۱] ممالک متحدہ کے یوروپی حلقۂ انتخاب کے علاوہ۔

اور صوبہ متحدہ اور پنجاب میں تو اس شخص کو اس عام حلقہ انتخاب کا، جس سے وہ کھڑا ہوتا ہے، باشندہ بھی ہونا چاہئے۔ امیدوار کی عمر کم از کم ۲۵ سال کی ہونی چاہئے۔

آخر میں ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے، کہ مقامی مجلس مقننہ اور جماعت مقننہ ہند میں بعض ایسے مخصوص نشستیں بھی ہوتی ہیں، جن کے لئے گورنر یا گورنر جنرل (جس سے بھی تعلق ہو) ارکان نامزد کرتا ہے۔ ان مخصوص نشستوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔ (ان نشستوں میں مقامی مجلس مقننہ کے لحاظ سے وہ جگہیں بھی شامل ہیں، جو گورنر کی مجلس عاملہ کے ارکان کو باعتبار عہدہ دیجاتی ہیں):-

مقامی مجالس مقننہ میں ۲۲ سے ۲۹ (مثلاً ۲۴ آسام میں، اور ۲۷ اصوبجات متوسطہ میں)

جمعیت مقننہ میں ۴۰

مجلس مملکت میں ۲۶

اندازاً ان تمام جگہوں میں سے دو ثلث عموماً سرکاری عہدہ داروں سے پر کی جاتی ہیں۔ اور یہ حکومت کے معتمدین، اور محکموں کے افسر اعلیٰ ہوتے ہیں۔ یہ سرکاری اعلیٰ عہدہ دار نہ صرف بیانات کے پیش کرنے اور حکومت کی طرف سے سوالات کے جوابات دینے میں ممد و معاون ہوتے ہیں، بلکہ زیر بحث معاملات کے متعلق انھیں بہترین تجربہ و معلومات بھی ہوتی ہے۔ واضح ہو کہ ۱۹۰۹ء کے مجالس کے برخلاف یہ عہدہ دار کسی مستقل سرکاری سیاسی گروہ کے رکن نہیں ہوتے اور اس کے ذریعہ مخالف کو شکست دیں، بلکہ اب ہر افسر ذاتی طور سے آزاد ہو کر مجلس مقننہ میں داخل ہوتا ہے، کہ جس طرح اور جس طرف چاہے، اپنی رائے کا اظہار کرے خواہ صورت حال کچھ بھی ہو، ان کی تعداد ہر مجلس میں نہایت کم ہے۔ کوئی سرکاری عہدہ دار بھی کسی انتخابی حلقہ سے امیدوار نہیں ہو سکتا۔ مقامی مجالس مقننہ کے مباحث میں ارکان مجلس عاملانہ متفقہ ایک ساتھ کام کرتے ہیں، اور وزرا ایک ساتھ اس کے ساتھ ہی کسی ایسی تجویز کے متعلق جس کو ان دو جماعتوں میں سے ایک جماعت پیش کر رہی ہو، اور دوسری جماعت اس کے مخالف ہو یہ طے کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس کی

تائید نہ کرے، تو کم از کم اس کو اس تجویز کی تقریر یا رائے کے ذریعہ مجلس مقننہ میں مخالفت نہ کرنا چاہیئے۔

ان سرکاری نشستوں کے علاوہ بذریعہ نامزدگی جو جگہیں بھری جاتی ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے، کہ ان کے ذریعہ ان خیالات کی نمائندگی کیجائے جو بذریعہ انتخاب نہیں کی جاسکتی۔ جمیعت مقننہ و مجلس مملکت کے لئے نامزد کرنے کے متعلق گورنر جنرل کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے، لیکن مقامی مجالس مقننہ کی نامزدگی کے سلسلہ میں گورنر کی آزادی ایک بڑی حد تک محدود کر دی گئی ہے، کیونکہ ان جماعتوں کو، جن کی ان نامزدگیوں کے ذریعہ حفاظت کرنا ہے، بیان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً پنجاب کے سوا ہر صوبہ میں پیچ قوموں کی نمائندگی کا سامان کیا گیا ہے، اور متعدد صوبوں میں کارخانوں کے مزدوروں کی نمائندگی کا بھی بندوبست عمل میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائیوں کی نمائندگی کے سلسلہ میں متعدد صوبوں میں انتخاب اور نامزدگی باری باری سے کی جاتی ہے اور پنجاب میں یوروپین جماعت کی نمائندگی بھی نامزدگی ہی سے عمل میں آتی ہے۔

(۵)

یہ دیکھ چکنے کے بعد کہ ہندوستان کی مجالس مقننہ کس طرح سے مرتب ہوتی ہیں، یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنے فرائض کس طرح انجام دیتی ہیں، اور ان کے اختیارات کیا ہیں۔

صوبہ داری مجلس مقننہ یا جمعیت مقننہ ہند، کی عام میعاد زندگی تین سال ہے اور مجلس مملکت کی (جو جماعت مقننۂ ہند کا دوسرا ایوان ہے) پانچ سال۔ گورنر جنرل کو اس بات کا اختیار ہے، کہ وہ جب چاہے دونوں ایوانہائے مقننۂ ہند کو برخاست کر دے اور اسی طرح صوبہ کے گورنر کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ صوبے کی مجلس مقننہ کو برخاست کر دے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے، کہ اس برخاستگی کے چھ ماہ یا زیادہ سے زیادہ ۹ ماہ کے اندر وہ دوسری مقننہ طلب کرے۔ گورنر (یا گورنر جنرل) کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ خاص حالات کے ماتحت کسی مقننہ کی میعاد حیات کی توسیع کرے، لیکن یہ میعاد مجلس مقننہ صوبہ کی حالت میں ایکسال سے زیادہ نہ ہوگی۔

اس قانون سے پہلے گورنر (یا گورنر جنرل) اوس مجلس کی جس کا وہ افسر اعلیٰ ہوتا تھا، اور جو اس کے متعلق ہوتی تھی، اوس کی صدارت کرتا تھا، اب آئندہ سے مجالس مقننہ خود ہی اپنے صدر منتخب کیا کریں گی، لیکن ابتدائی چار سال کے لئے ہر مجلس کا صدر سرکاری ہوگا اور اس کا فرض یہ ہوگا کہ وہ ارکان کو ان کے جدید اختیارات کے استعمال میں ہدایت کرنے کے ساتھ، پارلیمنٹی روایات کی تعمیر میں ان کی مدد کریں، مسٹر (اب سر) اے ایف وائٹ (A. F. Whye) جو جمعیت مقننۂ ہند کے اولیں صدر تھے، برطانوی دارالعوام کے رکن ہونے کی وجہ سے بہت کچھ تجربہ کار تھے بعض صوبوں میں کوئی برطانوی عہدہ دار وہاں کی مجلس مقننہ کا صدر بنایا گیا، اور بعض میں کوئی ہندوستانی قومی کارکن اس عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ اب چونکہ گورنر (یا گورنر جنرل) مجلس کا صدر نہیں رہا اس لئے وہ اب اس کا رکن بھی نہیں، لیکن اس کو اس بات کا حق حاصل ہے، کہ وہ اس مجلس کے سامنے تقریر کر سکتا ہے، اور اس غرض کے لئے

جب چاہے مجلس کو طلب کر سکتا ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابل لحاظ ہے، کہ اسی وجہ سے مجلس مقننہ کا اجلاس گورنر کے مکان کے ایک حصہ کی بجائے (جیسا کہ عہد مغلیہ کے زمانے سے روایۃً ہوتا چلا آیا تھا) اپنی علحدہ عمارت میں ہوتا ہے۔

اس خیال سے کہ مجلس مقننہ کے منتخب شدہ ارکان کو حکومت کے حقیقی مسائل سے اچھی طرح سے واقف کیا جائے، ہر صوبہ میں مستقل ذیلی جماعتیں (یا مشورتی مجالس جن میں ارکان مجالس مقننہ بھی شامل ہوتے ہیں) بنائی گئی ہیں۔ ان کا مقصد خالصۃً تعلیمی ہے، اور ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے، کہ یہ جماعتیں (یا مشورتی مجالس) حکومت عاملانہ کی کارروائیوں پر کوئی انتظامی اثر ڈالیں[1]۔ اسی خیال سے قانون اصلاحات[2] میں یہ طے کر دیا گیا ہے، کہ جس طرح پارلیمنٹری نائب معتمد، برطانوی وزارت اپنے متعلق وزیر کو مدد دیتا ہے، اسی طرح گورنر (یا گورنر جنرل) کو اس بات کا حق ہے کہ وہ صوبوں کے مجلس مقننہ (یا مجلس مقننۂ ہند) کے غیر سرکاری ارکان میں سے بعض کو اس لئے منتخب کرے کہ وہ مجلس عاملہ کے ارکان کو مدد دیں، اور اس طرح انتظامی تجربہ حاصل کریں۔ اس قانون سے مدراس، پنجاب، اور صوبجات متوسطہ میں استفادہ حاصل کیا جا رہا ہے۔

ایک اہم ترین کمیٹی وہ ہے جو "حسابات عامہ کی کمیٹی" کے نام سے موسوم ہے، اور جس کے صوبہ داری مجالس مقننہ اور جمعیت مقننۂ ہند میں قائم کرنے کا بندوبست "قواعد کارروائی" کے ذریعہ کیا گیا ہے[3]۔ مجلس عاملہ کا رکن مالیات اس کا صدر ہوتا ہے،

---

[1] اکثر صوبوں میں ایک مستقل مجلس مالیات ہے جو جدید اخراجات کے متعلق مشورتی خدمات انجام دیتی ہے۔ ہر محکمہ حکومت کے متعلق بنگال اور پنجاب میں، مستقل جماعتیں (صوبجات متحدہ میں مشورتی مجالس، ہیں بہار و اڑیسہ میں محفوظ محکموں کے لئے ایک جماعت ہے، اور مفوضہ کے لئے مہری

[2] دیکھو دفعات ۴ (۴) اور ۲۹، قانون ہند۔

[3] دیکھو قواعد ۵۱ و ۵۲ متعلقہ قواعد جمعیت مقننۂ ہند و قواعد ۳۳ و ۳۴ قواعد مجالس مقننہ صوبجات۔

اوراس میں صدر سمیت زائد از زائد ۱۲ ارکان ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۲/۳ کو غیر سرکاری ارکان نیابت متناسبہ کے اصول پر منتخب کرتے ہیں اور باقی نامزد کئے جاتے ہیں۔ اس مجلس کا فرض ہے، کہ وہ اخراجات کے حساب کی تنقید کرکے یہ دیکھے، کہ یہ اخراجات پیش شدہ تجاویز کے مطابق عمل میں آئے ہیں یا نہیں، اور پھر اپنی اس جانچ کے نتائج کو پیش کرے[1]۔

"عملی قوانین[2] میں اس بات کی بھی سہولت رکھی گئی ہے کہ وہ ارکان جو اچھی طرح سے انگریزی نہیں بول سکتے ہیں، کسی ملکی زبان میں تقریر کر سکتے ہیں، اور پنجاب[3] و صوبہ متوسط میں اس سے خاص طور سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، تاہم عموماً تمام کارروائی انگریزی ہی میں ہوتی ہے۔

قانون اصلاحات کے دوسرے قواعد کی طرح "عملی قوانین" متعلقہ مجالس صوبہ و مجالس مقننۂ ہند بھی پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہو چکے ہیں، اور صرف اسی مجلس کی منظوری پر ان میں ترمیم کی جا سکتی ہے، پھر بھی ان قوانین کے ساتھ وہ احکامات بھی بطور ضمیمہ موجود ہیں، جن کو گورنر (یا گورنر جنرل) کونسل نے ابتداً بنایا اور جن میں جماعت مقننہ (یا ایوان) جس کے وہ متعلق ہوں ترمیم کر سکتی ہے۔

چونکہ دستور کے ذریعہ جماعت مقننہ کو مجلس عاملہ پر کامل اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں، اس لئے گورنر (یا گورنر جنرل) کو یہ حقوق محفوظ ہیں، کہ وہ مجلس مقننہ کے استصواب کے بغیر آزادانہ مرکزی، یا صوبہ کے محفوظ محکموں کے متعلق قانون وضع کر سکتا ہے، مگر یہ اختیارات خاص خاص حالات ہی میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جماعت مقننہ کے متعلق گورنر (یا گورنر جنرل) کے اختیارات

---

[1] اس کمیٹی کے فرائض کو مال کی مستقل کمیٹی کے فرائض سے جن سے ہر نئے خرچ کے متعلق مشورہ کیا جاتا ہے خلط مبحث نہ کرنا چاہئے۔ جمعیت مقننۂ ہند میں اس قسم کی ایسی مال کی کمیٹی ہے نیز متعدد صوبوں کی مجالس مقننہ میں بھی ایسی کمیٹیاں ہیں۔

[2] دیکھو ہر سلسلۂ قوانین کا قانون ۱۴۔

[3] پنجاب میں قواعد کی اس حد تک ترمیم کر دی گئی ہے کہ وہاں ملکی زبان کے نسبتہً آزادانہ استعمال کی اجازت مل گئی ہے۔

عموماً یہ ہیں:۔ کسی صوبہ داری مسودہ کے قانونی شکل اختیار کرنے سے پہلے ضروری ہے۔ کہ اس کے لئے نہ صرف گورنر بلکہ گورنر جنرل کی بھی منظوری حاصل کی جائے، دونوں میں سے کوئی بھی اس کو مسترد کر سکتا ہے، اور یہ استرداد فیصلہ کن ہوتا ہے۔ گورنر جنرل کی منظوری کو عموماً تاج کی منظوری کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تاج کو اس بات کا حق ہر وقت حاصل ہے کہ وہ مجالس مقننۂ ہند یا صوبہ کے کسی قانون کو ممتنع کر دے۔ مجالس مقننۂ ہند کے مرتبہ کو عملاً بلند تر کرنے کے لئے یہ قرار پایا ہے کہ آئندہ سے تاج کی خوشنودی، وزیر ہند باجلاس کونسل کی بجائے حضور ملک معظم باجلاس کونسل (یعنی پریوی کونسل کی عام صلاح کی بنا پر) کے مطابق ہوا کریگی۔ ہندوستان کی کسی جماعت عاملہ کے حاکم اعلےٰ کو یہ حق بھی حاصل ہے، کہ وہ کسی مسودۂ قانون کو ایک اعلیٰ ترین افسر کی حصول اجازت تک کے لئے ملتوی کر دے اور وفاقی قانون ساز جماعتوں میں یہ عمل عام طور پر پایا جاتا ہے۔ پہلے یہ حق التوا صرف گورنر جنرل کو حاصل تھا۔ لیکن اب کناڈا کی طرح صوبوں کے حاکم اعلےٰ تک اس کی توسیع کر دی گئی ہے۔ تاہم اس معاملہ میں اس کا یہ اختیار عام کی بجائے خاص خاص حالات تک کے لئے ہی محدود ہے، چنانچہ جس قانون کو ایک گورنر کو، گورنر جنرل کی رائے کے حصول تک ملتوی رکھنا چاہئے، اس کے لئے یہ شرائط ضروری ہیں کہ یہ مسودے (۱) نظام مالگزاری پر بہت اثر ڈالتے ہوں، (۲) کسی قوم کے کسی مذہب پر ان کا اثر پڑتا ہو، (۳) کسی چھوٹی پٹڑی کی ریل کی تعمیر یا کسی جدید جامعہ کی بنا کے متعلق ہو۔ اس کے علاوہ ایسی تجاویز بھی ہو سکتی ہیں، جن کو گورنر خود اپنی قوت تمیزی کی بنا پر روک سکتا ہے، مثلاً ایسے مسودے جو (۱) کسی دوسرے صوبہ کے مفاد پر اثر ڈالتے ہوں، (۲) بعض مرکزی مسائل (۳) کوئی ایسا معاملہ جو شاہی ہدایت ناموں کے ماتحت گورنر کو خاص طور پر ذمہ دار کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح گورنر جنرل کو بھی اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ایسے قانون کو جسے کسی مقامی مجلس نے منظور کیا ہو

تاج کی منظوری کے لئے، روک دے۔ یہ مسودہ جات ان مسودوں کے علاوہ ہوں گے جو کسی مقامی حکومت نے اس کے ایماء کے لئے روک دیئے ہیں اس قسم کے محفوظ مسودات کو وہ خود منظور کر سکتا ہے، اور اگر چھ ماہ تک اس پر اس کی منظوری حاصل نہ ہو سکی، تو وہ مسودہ بیکار ہو جائے گا، یا وہ اس مسودہ کو گورنر کے پاس لوٹا سکتا ہے، کہ وہ اسے نظر ثانی کے لئے دوبارہ مقامی مجلس مقننہ کے سامنے پیش کرے۔ مسودہ کو حکومت عاملہ کے بیان کے ساتھ دوبارہ پیش کرنا، اس قانون کا عطا کردہ نیا اختیار ہے، اور یہ اختیار گورنر جنرل اُن قوانین کے متعلق جو دونوں مرکزی ایوانہائے مقننہ نے منظور کیا ہو، یا گورنر اپنے صوبہ کی مجلس مقننہ کے متعلق استعمال کر سکتا ہے۔

اگر کوئی مسودہ ایسا ہو، جس کو دونوں مرکزی ایوان متحدہ طور سے منظور نہ کر سکیں، تو گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دونوں ایوانوں کا متحدہ اجلاس طلب کرے، اور اسی اجلاس کے موجودہ ارکان کی کثرت رائے پر اس مسودہ کا تصفیہ ہو گا۔

اب جبکہ ہم ان اختیارات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو جدید مجالس مقننہ کو مالیات کے متعلق حاصل ہوئے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ چونکہ مجلس مقننہ کو مرکزی یا صوبوں کے محفوظ محکموں کے متعلق مجلس عاملہ کے مقابلہ میں کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے، اس لئے گورنر یا گورنر جنرل کو ایسے اختیارات دئے گئے ہیں، کہ وہ ان اخراجات کے متعلق جن کو وہ ضروری سمجھتا ہے مستند قرار دے، کر ان کو اپنے خاص اختیارات کے ذریعہ خود ہی منظور کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ گورنر (یا گورنر جنرل) ان محکموں کو جو براہ راست اس کے متعلق ہیں، اس وقت تک برقرار نہیں رکھ سکتا، جب تک کہ اسے ان کے قیام کے لئے مجلس مقننہ سے آزاد مالی اختیارات حاصل نہ ہوں، اور نہ اس کو اس مقصد کے حصول کے لئے اپنے اس اختیار کے استعمال سے ذرا بھی تامل کرنا چاہیئے۔ عموماً مندرجۂ ذیل محکموں کے علاوہ تمام محکموں کے اخراجات مجلس مقننہ متعلقہ کی منظوری کے ماتحت ہیں لیکن مندرجۂ ذیل اخراجات کے لئے کسی منظوری کی ضرورت نہیں یعنی :-

(۱) وہ اخراجات جن کی تفصیل گورنر جنرل باجلاس کونسل نے کی ہو، مثلاً (الف) کلیسائی اخراجات (ب) سیاسی اخراجات (ج) مدافعت (۲) قرضہ جات کے سود اور ذخیرۂ ادائی (۳) ایسے لوگوں کی تنخواہیں، یا پنشنیں جن کو ملک معظم نے خود یا ان کی منظوری یا وزیر ہند یا جلاس کونسل کی منظوری سے مقرر کیا گیا ہو؛ (۴) مقامی مجالس مقننہ کے متعلق صوبوں کی وہ رقم جو مرکزی حکومت کے محکمۂ مال کو روانہ کی جاتی ہے، عام دستوری رسم کے مطابق آمدنی کا کوئی حصہ بھی مجلس عاملہ کی سفارش کے بغیر خرچ نہیں کیا کیا جا سکتا[۱] دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ مجلس مقننہ اس خرچ کو یا تو مسترد یا اس میں تخفیف کر سکتی ہے، لیکن اس کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسری، مدوں سے رقم گھٹا کر کسی ایک مد میں اضافہ کرے۔

یہاں پر اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے کہ مختلف مدات اخراجات میں موجودہ آمدنی کی تقسیم کو ان مالی تجاویز (یعنی مالی مسودوں) سے تمیز کیا جائے جن کے ذریعہ سے جدید محاصل عائد کرنا قرار پائے اور جن کے لئے مجلس مقننہ کی منظوری بہت ضروری ہے۔ اس قسم کے نئے محاصل کی بابت تمام تحریکات کے لئے ضروری ہے کہ ان کو مجلس مقننہ متعلقہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ جائز عملی صورت اختیار کرنے سے پہلے ان کی منظوری حاصل کر لی جائے۔ دوسرے مسودوں کی طرح نئے محاصل کے اجرا کے لئے بھی دونوں ایوانوں کی متحدہ منظوری ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی مرکزی یا صوبہ داری اخراجات، مسودات کی جگہ "مطالبات برائے منظوری" کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں، یہ جمعیت مقننہ ہند کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور یہ وہ مجلس ہے، جو اپنی کمیٹی متعلقۂ اخراجات عامہ کے ذریعہ مرکزی حکومت کے احتساب و اخراجات کی تحقیق و تنقید کرتی ہے۔ جدید محاصل کے اجرا یا موجودہ محاصل میں اضافہ یا قرضہ لینے کے اختیارات جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مقامی حکومتوں کو بھی دیئے گئے ہیں۔

مالیات کی کم از کم دو مدوں کے متعلق ہندوستانی آرا کا بہت زیادہ

---

[۱] دیکھو دفعات ۱۱ (۲) (ج) اور ۲۵ (۲) قانون (اصلاحات)

لحاظ کیا گیا ہے، اور امید ہے کہ ان سے دیرینہ اختلافات کا خاتمہ ہو جائے گا۔
یہ مراعات وہ ہیں جن کو مشترکہ منتخب کمیٹی بابت مسودۂ اصلاحات کی سفارشوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، اور چونکہ یہ کمیٹی پارلیمنٹ کے ممبروں کی مقرر کردہ ہے اس لئے جو اس کی سفارش ہے وہ پارلیمنٹ کی ہی سفارش تصور کرنا چاہئے۔
ان میں سے ایک محصول درآمد و برآمد اور اس کا تعلق مرکزی حکومت سے ہے، اور دوسرا لگان اراضی سے متعلق ہے، اور چونکہ اب جدید نظام کے ماتحت یہ آمدنی تمام تر صوبوں کے متعلق ہو گئی ہے اس لئے اس کی بابت تمام حقوق بھی مقامی مجالس مقننہ کو حاصل ہو گئے ہیں۔
محصول برآمد و درآمد کے متعلق مشترکہ منتخب کمیٹی نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:۔
"اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل یہی ہو سکتا ہے، کہ حکومت ہند کو اس بات کی کامل آزادی دیدیجائے کہ وہ ہندوستان کو برطانوی حکومت کا ایک لازمی جزو سمجھتے ہوئے، اس کی بیرونی تجارت کے متعلق جو مفید انتظام سمجھے کرے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے اس کمیٹی کی رائے ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ حکومت ہند اور مجلس مقننہ کسی معاملہ میں متحد ہوں، تو وزیر ہند کو حتی الامکان اس میں مداخلت کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے[۱]، اور کمیٹی کا خیال ہے، کہ اگر ایسی مداخلت کی جب کبھی ضرورت ہو تو اسے صرف ان معاملات کے تحفظ تک محدود رہنا چاہیئے

---

[۱] حقیقۃً یہ ایک دستوری رسم ہے، جو عام تر حالات پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے۔ گورنر جنرل کے شاہی ہدایت نامے میں اس کی توضیح کی گئی ہے، اور اسے صوبوں کے محفوظ محکموں کے متعلق مندرجۂ ذیل طریقہ پر عمل پیرا ہونے کو کہا گیا ہے:۔
"(۷)۔ خاص طور سے یہ ہماری مرضی و خوشی ہے، کہ نگرانی ہدایت اور حکومت کے جو اختیارات ہمارے گورنر جنرل موصوف اور ہمارے گورنر جنرل باجلاس کونسل کو مذکورہ مقامی حکومتوں کے متعلق دیئے گئے ہیں، بشرطیکہ کوئی متضاد صورت حال پیدا نہ ہو، تو ان اختیارات کو اس طرح استعمال کیا جائے، کہ ان سے ہمارے گورنروں کی حکمت عملی کو تقویت ہو، مگر شرط یہ ہے، کہ اس صوبہ کی مجلس مقننہ کی اکثریت بھی اسکی حامی ہو"۔

جو بین الاقوامی حیثیت سے ضروری ہوں، یا کسی ایسے مالی بندوبست کے متعلق ہوں، جس کا تعلق ملک معظم کی حکومت سے ہو۔"

دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے، کہ اس کے متعلق ذرا بھی شک کی گنجائش نہ رہے، کہ ہندوستان کی تجارت کی حکمت عملی برطانوی تجارت کے مفاد کے ماتحت وھائٹ ہال (دفتر وزیر ہند) کے قبضے میں ہے، یا لنکاشائر کے روئی کے کارخانوں کے مفاد کے ماتحت ہے؛ اور یہ ظاہر ہے کہ ان کا مفاد ہمیشہ آزاد تجارت کے موافق ہو گا۔ گزشتہ سال (۱۹۲۱ء) ہندوستان کے قواعد چنگی کی، جو ذرا سختی سے ترمیم ہوئی ہے، اور جس کا اصلی مقصد محض آمدنی میں اضافہ کرنا تھا، وہ برطانوی نیک نیتی کا ایک مزید ثبوت تھا۔

مالگذاری کی جو رقم پہلے مرکزی و صوبہ داری حکومت کی مشترک ملکیت تھی، اب صرف صوبہ ہی کے متعلق ہے اور صوبہ کی آمدنی کا تقریباً سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس مفروضے کی بنا پر کہ حکومت نے ہندوستان میں اپنے کو "اعلیٰ ترین زمیندار" کے بھی حقوق سے محروم کر دیا ہے، بعض لوگ مالگزاری کو ایک محصول تصور کرتے ہیں، اور اس کے برخلاف بعض اس کے معنی محض "لگان" کے لیتے ہیں۔ ہم اپنے موجودہ مقصد کے لئے، جو یہ ہے کہ اراضی کی رقم محصلہ کا تعلق اس شخصیت کے ساتھ دکھائیں جو اس کا تعین کرتی اور اس کی منظوری دیتی ہے، اس کو محصول ہی کے لفظ سے تعبیر کریں گے۔ ملک کے بعض حصص میں، اور خصوصاً بنگال میں، اواخر اٹھارھویں صدی میں، یہ رقم ہمیشہ کے لئے مقرر کر دی گئی ہے، باقی اراضی میں حالات کی تبدیلی، اور خصوصاً زراعتی اراضی کی قیمت کے اضافہ کی وجہ سے، یہ رقم ہر ۲۰ یا ۳۰ سال کے وقفہ کے ساتھ متعین ہوتی رہتی ہے۔ اس بندوبست کا انتظام تجربہ کار حکام بندوبست کے ماتحت ہوتا ہے، اور وہ اعلیٰ افسران مال کے ماتحت کام کرتے ہیں، اور انہی افسروں کے سامنے تشخیص کا اولین مرافعہ بھی ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کام نے اب ایک منظم علمی صورت اختیار کر لی ہے۔ بہر حال یہ واقعہ اپنی جگہ پر ہے، کہ یہ تشخیص مالگزاری حکومت عاملہ کے حکم سے لگائی جاتی ہے، اور اسی کی منظوری سے

مقرر کی جاتی ہے، اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، یہ حکومت خود اختیاری کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اس اصول کا مقصد یہ ہے کہ محصول محصول دہندوں کی منظوری سے مقرر ہونا چاہئے، اس کے ساتھ ہی اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مجلس مقننہ کی منظوری لازمی ہے اس لئے کہ مقامی حکومت میں یہی سب سے بڑی موثر ٹیکس لگانے والی قوت ہے اور کسی ٹیکس میں اضافہ کرنے سے پہلے اس کے لئے اس کی منظوری لینا بسا ضروری ہے۔ صوبوں کی مجالس مقننہ کے ذریعہ لگان کے اضافہ کے عام اصولوں کی تجویز کو سنہ ۱۹۰۶ء میں شاہی ماموریہ لامرکزیت نے ہی مقرر کر دیا تھا[1]، اور اب اس تجویز کو جس کا مقصد، نظام لگان کو قانونی صورت دینا تھا، مشترکہ منتخب کمیٹی نے اپنے تمام اختیارات کے ساتھ تسلیم کر لیا ہے۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ "اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اب قانون میں ان بنیادی اصول کو شامل کر دیا جائے، جن کے ذریعہ لگان کا تعین، طریقہ تقرر قیمت، تشخیص رقم، عہد بندوبست آئندہ، مدارج اضافہ، اور دوسری ضروری کارروائیوں کا اصول قائم ہو سکے جو لگان دہندہ کے مفاد کے مطابق ہوں"۔ اس زبردست اجرائے محصولات کے آلۂ کار کو، نمائندہ مجلس مقننہ کے قبضے میں لانے کا کام صوبہ مدراس میں شروع ہو چکا ہے۔

(۶)

اگرچہ مجلس مقننہ ہند کی ہیئت میں کافی تبدیلی پیدا ہو گئی، اور سرکاری آراء کے مقابلہ میں رائے عامہ کو دونوں ایوانوں میں جو فوقیت دیدی گئی ہے اس نے عموماً اور مالیات کی حیثیت سے خصوصاً اس کے اختیارات میں جو توسیع پیدا کر دی گئی ہے اس کو بہت بدل دیا ہے؛ لیکن مرکزی حکومت عاملہ

[1] دیکھو رپورٹ "شاہی ماموریہ لامرکزیت Royal Commission on Decentralization پارہ ۲۵۲"، "ہمارا خیال ہے کہ تشخیص کے عام اصول کو مثلاً یہ کہ آمدنی کا کونسا حصہ لینے کا حق حکومت کو ہوگا، اور بندوبست کا زمانہ کب ہوگا، حکومت عامہ کی جگہ صوبہ کی مجلس مقننہ کو طے کرنا چاہئے اور بمبئی میں اس وقت یہی صورت حال ہے"۔

کا بنیادی اصول اب بھی اپنی جگہ پر علیٰ حالہٖ ہے۔ اس کے مقابلہ میں گورنر جنرل باجلاس کونسل کو مجلس مقننۂ ہند سے وہی تناسبی تعلق ہے، جو گورنر بہ اجلاس کونسل کو مقامی مجلس مقننہ سے ہے۔ یعنی حکومت عموماً و عملاً تمام کاموں میں جماعت مقننۂ ہند کے ماتحت ہے، لیکن چونکہ گورنر بہ اجلاس کونسل جماعت مقننہ کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اس لئے نہ یہ جماعت گورنر کو ہٹا سکتی ہے، اور نہ اسے کسی کام کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔

مرکزی حکومت کے (اور بالکل یہی حال صوبہ کی حکومتوں کا محفوظ محکموں کے متعلق ہے) مجلس مقننہ سے جو تعلقات ہیں، ان کو گورنر جنرل کے شاہی ہدایت نامے میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

۸۔ یہ ہماری مرضی وخوشی ہے، کہ ہمارا گورنر جنرل موصوف، ہمارے اور ہماری پارلیمنٹ کے متعلق اپنی تمام ذمہ داریوں کا خیال رکھتے ہوئے، ہماری ہندوستانی رعایا کے فلاح وبہبودی کے لئے پوری کوشش کرے، اور ہمارے گورنر باجلاس کونسل کو جو فرائض انجام دینے پڑتے ہیں، وہ ہماری رعایائے مذکور کی موافقت ورضامندی کا خیال رکھے۔ اور وہ مجلس مقننہ میں اس کا اظہار کرے، اور جہاں تک ہو سکے وہ اسے معقول ومنصفانہ سمجھے گا"

مرکزی حکومت کی تبدیلیاں بہت ہی معمولی ہیں۔ رکن قانون کے لئے ہندوستانی قانونی تعلیم، برطانوی تعلیم کے مساوی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مجلس عاملہ کے ارکان کی تعداد ۶ کی تحدید اٹھا لی گئی ہے، معمولی اور غیر معمولی رکن کا اختلاف بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ ایک اہم تبدیلی جو قانون اصلاحات سے بالکل علیحدہ عمل میں آئی ہے، یہ ہے کہ مجلس عاملہ میں (پہلے کی طرح) ایک یا منتخب کمیٹی کی سفارش کے بموجب[۱] دو کی جگہ تین ارکان ہندوستانی ہوں گے۔ اور اس وقت وائسرائے اور سپہ سالار ہند کو ملا کر مجلس عاملہ کے ۸ ارکان ہیں۔

اگرچہ اس بات کو برطانوی ہند کو عطا کردہ آئین سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے،

۱؎ دیکھو جائینٹ رپورٹ پارہ ۲۷۔

مگر یہ امر قابل غور ہے، کہ ایک مستقل ایوان والیان ریاست (نرندر منڈل) بھی قائم ہوا ہے، تمام بڑے بڑے والیان ریاست اس کے رکن ہو گئے ہیں، اور چھوٹے والیان ریاست کی نمائندگی ایک چانسلر (مہاراجہ بیکانیر) کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی مجلس عاملہ بھی بنائی گئی ہے۔ اس کے دو مقاصد ہیں:۔

(۱) ہندوستانی ریاستوں کو حکومت ہند کے ساتھ اشتراک عمل کے لئے تیار کیا جائے۔ اور (۲) ایسے معاملات پر جن کا اثر دیسی ریاستوں کے مفاد پر مشترکہ طور پر پڑتا ہو، غور و فکر کی جائے۔ حکومت ہند اور دیسی ریاستوں کے مابین، ایک اور جدید مشترک تعلق وہ آئین ہے، جس کے ذریعہ سے، (۱) کسی دیسی ریاست کے انتظام کی خرابی یا اس کے حکمراں کی بداخلاقی کی تحقیقات کے لئے کمیشن مقرر کیا جا سکتا ہے اور اس میں ایوان والیان ریاست کے قائم مقام نشست کریں گے۔ اور (۲) ایسی ثالثی عدالتوں کی ترتیب دی جا سکتی ہے، جو دو ہندوستانی ریاستوں یا ایک ہندوستانی ریاست اور مرکزی یا صوبہ واری حکومت کے باہمی اختلافات کا فیصلہ کریں۔

(۷)

محکمۂ وزارت ہند کے نظام میں بہت ہی معمولی مادی تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں۔ اب بھی وزیر ہند کو تمام معاملات میں عموماً اور تقرری اور اخراجات کے معاملہ میں خصوصاً جن کی وہ دستوری حیثیت سے نگرانی کرتا ہے، ایک مجلس یعنی مجلس ہند مشورہ دیتی ہے۔ اس کے ارکان کی تعداد میں اب دو کی کمی کر دی گئی ہے، ایسے لوگوں کی تعداد جنھوں نے ہندوستان میں ملازمت یا سکونت کی ہو، گھٹا دی گئی ہے؛ پہلے ان کی تعداد ۹ تھی، اور اب وہ پوری تعداد کا نصف کر دی گئی ہے اور یہ پوری تعداد کم از کم ۸ اور زیادہ از زیادہ ۱۲ پر مشتمل ہوتی ہے، اور زمانہ ملازمت کو بھی ۷ سال سے ۵ سال کر دیا گیا ہے۔ یہ انتظام ہندوستانی ارکان کے لئے جگہ نکالنے کے لئے کیا گیا ہے اور اس وقت (مارچ ۱۹۲۲ء) میں ارکان کی مجلس میں ۳ ہندوستانی ہیں۔ قانون (اصلاحات) نے اس غرض سے کہ کام، محکموں کے ذریعہ

بلا واسطہ انجام پانے لگیں، وزیر ہند با اجلاس کونسل کے عام اختیارات کی گرفت کو بہت ڈھیلا کر دیا ہے، اور یہ طے کیا گیا ہے، کہ وہ اجلاس جو ہر ہفتہ ہوتا تھا، وہ مہینہ میں ایک بار ہوا کرے۔ اگرچہ یہ تجویز اپنی جگہ پر باقی ہے، لیکن ہفتہ وار اجلاس اب بھی منعقد ہوتے ہیں۔

قانون (اصلاحات) میں یہ بھی طے ہوا ہے، کہ وزیر ہند کی تنخواہ جو پہلے ہندوستانی روپیہ سے دی جاتی تھی، آئندہ سے برطانوی پارلیمنٹ کی منظور کردہ رقم سے دیجائے اور اس طرح اس کے نائبوں اور مجلس ہند کے ارکان کی تنخواہیں اور دوسرے اخراجات بھی اس منظور کردہ رقم سے لئے جائیں[1]۔ اس سے ایک طرف تو ہندوستان کی ایک دیرینہ شکایت دور ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف اب چونکہ وزیر ہند کی تنخواہ برطانوی موازنہ میں ہو گی اس لئے اس بات کا موقع ہو گا کہ جس طرح دوسرے محکموں کے وزراء کے متعلق دارالعوام کی مجلس اخراجات میں دلچسپی سے بحث ہوتی ہے، اسی طرح اب اس مجلس میں ہندوستان کے معاملات پر بھی تبادلۂ خیالات ہو سکے گا[2]۔

پارلیمنٹ میں ہندوستانی معاملات کے متعلق وہی دلچسپی پیدا کرنے کے لئے جو وہ اس وقت لیتی تھی، جب کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مربی و ناقد تھی، اور جو ۱۸۵۸ء سے ایک بڑی حد تک کم ہو گئی تھی، ذیلی جماعت متعلق معاملات ہند قائم کی گئی اور اس مجلس کو ہر جدید اجلاس کے وقت منتخب کیا جاتا ہے۔ اس میں ۱۱ ارکان دونوں ایوانوں سے منتخب ہوتے ہیں، اور وہ ہر خیال کے لوگوں کے

---

[1] یہ طے پایا ہے کہ وزیر ہند اور اس کے پارلیمنٹی نائب معتمدوں کی تنخواہوں کے علاوہ، برطانوی خزانہ، دفتر ہند کو ۱۳۶۰۰۰ پونڈ دیا کریگا، چنانچہ بجائے ۵۰۰۰۰ پونڈ کی سابقہ رقم کے اب ایسی رقوم کی مجموعی تعداد ۱۴۲۵۰۰ پونڈ ہوتی ہے۔ یہ دفتر وزیر ہند کے تمام اخراجات کے لئے کافی ہے، البتہ ہائی کمشنر کے محکمہ سے متعلق جو اخراجات ہیں وہ الگ ہیں۔

[2] دیکھو جائنٹ رپورٹ پارہ ۲۹۴ ۔ ۱۹۰۶ء میں وزیر ہند کی تنخواہ کو برطانوی موازنہ میں شامل کرنے کی تحریک کی گئی تھی، اور اس بنا پر کہ یہ تبدیلی ہندوستان کے نظام حکومت کو مختلف الخیال جماعتوں کا تختۂ مشق بنا دیگی، ایک بڑی اکثریت سے مسترد کر دی گئی تھی۔ دیکھو جائنٹ رپورٹ پارہ ۲۳۔

نمائندوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ مجلس مشترکہ منتخب کمیٹی کی جگہ پر قائم کی گئی ہے جس موخرالذکر کمیٹی سے قانون (اصلاحات) اور اس کے تحتی ضوابط کے بنانے میں بڑی مدد دی تھی۔ اس جماعت کے سامنے مندرجۂ ذیل چیزیں خاص طور سے پیش کی جائینگی۔ (۱) ایسے قوانین جن کو ہندوستان کے کسی صوبہ کا کوئی گورنر، یا گورنر جنرل کسی مجلس مقننہ کے خلاف اپنے استناد سند کے ذریعہ منظور کرے گا، اور جن کا پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے۔ (۲) ایسی تمام ترمیمات جو قانون حکومت کے قواعد کے جواب میں کیجائیں، جن کی ضرورت ہندوستان کے جدید دستور کے تجربہ اور ہندوستان کے سیاسی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے وقتاً فوقتاً محسوس ہوتی رہے۔

قانون اصلاحات کی ایک اہم دفعہ[1] وہ ہے جو اسے ہندوستان کے لئے ایک ہائی کمشنر (مامور اعلیٰ) کے مقرر کرنے کا اختیار دیتی ہے۔ اور یہ اسلئے کہ وہ ہندوستان کو قلمرو برطانیہ کے ایک جزو کی حیثیت سے اسے اور بھی زیادہ اہم اور خاص درجہ دیتی ہے اس عہدہ دار کا پریوی کونسل کے حکم کے ذریعہ تقرر ہو چکا ہے، اور اس کے ذمہ وہ کام دیا گیا ہے، جو فرائض گماشتگی کے نام سے، وزیر ہند حکومت ہند کے قائم مقام کی حیثیت سے انجام دیتا تھا، اب ہائی کمشنر، حکومت کا جس کی ہدایات کے بموجب وہ کام کرتا ہے مصدقہ گماشتہ ہے، اور اس کا تقرر قریباً وہی درجہ ہے، جو دوسرے قلمروں کے مصدقہ نمائندوں کا۔ ان ہی لوگوں کی طرح وہ ہندوستان کے خاص سرکاری تجارتی نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے[2][3]۔

---

[1] دیکھو دفعہ ۳۵ قانون (اصلاحات)۔

[2] ہائی کمشنر کے دفتر کے اخراجات (تقریباً ۲ لاکھ پونڈ) کو اصولاً ہندوستان اپنی آمدنی سے ادا کرتا ہے

[3] مشرقی افریقہ میں بھی ایک ہندوستانی تجارتی کمشنر جس کے فرائض ایک قنصل کے فرائض جیسے ہوتے ہیں، مقرر کیا گیا ہے، اور سنہ ۱۹۲۲ء کے قانون ترک وطن کے ماتحت اس بات کا حق حاصل کیا گیا ہے، کہ جن نوآبادیوں میں ضرورت محسوس کی جائے، وہاں اس نوآبادی کی حکومت سے استصواب کر کے اس قسم کے مامور مقرر کئے جائیں۔

باب پنجم (۵)

عہد جدید کے بعض سیاسی مسائل

وزیر ہند نے اپنے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء والے بیان میں جس حکمت عملی کا اعلان کیا تھا، اس کا ایک اہم ترین جزیہ ہے کہ "ہر شعبۂ انتظامی میں ہندوستانیوں کی روزافزوں شرکت ہوگی" ہم اس سے قبل دیکھ چکے ہیں کہ حکومت کی ملازمتوں کے لئے جس کے وہ قابل ہوں ہندوستانیوں کے استحقاق کے اصول کی [1] ۱۸۳۳ء کے قانون دستوری کے ذریعہ تصدیق ہوچکی تھی، اور اس کے بعد ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ء کے اعلان میں جس کی ان الفاظ میں تصدیق کی گئی :-

"اور یہ ہماری مزید خواہش ہے، کہ جہاں تک ہو سکے ہماری رعایا کو خواہ وہ کسی مذہب و ملت کی ہو آزادانہ اور بلا تفریق مذہب و ملت وہ عہدے تفویض کئے جائیں، جن کے فرائض کے ادا کرنے کی تعلیم و لیاقت وہ حاصل کرچکی ہو"

اگر اہلیت و قابلیت کے سوال کو نظر انداز نہ بھی کریں تاہم ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا، کہ ان وعدوں کا پورے طور سے ایفا نہیں کیا گیا، اور نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے، کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اس بات کی حال میں سخت شکایت پیدا ہوئی

[1] دیکھو باب (۱) دفعہ (۴)

ہند؛ وہ شکایت ایک بڑی حد تک بیجا بھی نہیں ہے، کہ ان کو سرکاری ملازمتوں میں درجہ نہیں دیا گیا، جس کے وہ اپنے معاشری و ذہنی اوصاف کی وجہ سے مستحق تھے۔ پہلے تو انڈین سول سروس کو لیجئے۔ پارلیمنٹ کے ایک قانون[۱] کے ذریعہ تقریباً تمام عاملانہ اور عدالتی اعلےٰ عہدے اس ملازمت کے لئے مخصوص ہیں۔ ۱۷۹۳ء سے (یعنی جس سال کہ یہ تخصیص کی گئی) ۱۸۵۳ء تک ان ملازمتوں کا تقرر ایسٹ انڈیا کے نظما، کرتے تھے ۱۸۵۳ء میں مجلس نظما، کے قبضے سے یہ اختیارات جاتے رہے اور اس کی جگہ میں ایک عام امتحان مقابلہ لندن میں منعقد ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس سے ہندوستانیوں کے مفاد کو بہت صدمہ پہنچا، جس کی تلافی کے لئے متعدد تجربے کئے گئے مثلاً ۱۸۶۹ء میں لارڈ لارنس نے جو اس وقت وائسرائے تھے، ہندوستانیو کے لئے چند ایسے وظیفے مقرر کئے جن کے ذریعہ وہ انگلستان میں تعلیم پاسکتے تھے، اور اس طرح اس ملکی ملازمت کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوسکتے تھے؛ لیکن حکومت انگلستان نے اس تجویز کو پسند نہ کیا، اور کچھ عرصے کے تجربے کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں ایک قانون منظور کیا گیا، جس کے ذریعہ یہ طے پایا کہ مصدقہ لیاقت و قابلیت کے ہندوستانیوں کے لئے مزید سہولتیں پیدا کرنے کی غرض سے، ان کو امتحان مقابلہ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی اس ملازمت میں داخل کیا جائے، اس قسم کے تقرر کے متعلق قواعد ۱۸۷۹ء میں بنائے گئے، اور طے کیا گیا کہ ایسی ملازمتوں کے لئے جتنی آسامیاں خالی ہیں، ان میں سے ⅙ کو حکومت ہند ہندوستانیوں کی نامزدگی سے پر کرے۔ اس نامزدگی کے ذریعہ جو لوگ مقرر کئے جاتے تھے وہ قانونی سویلین کہلاتے تھے لیکن اس ترکیب سے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں ہوئے، اور ۱۸۹۹ء میں اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب سول سروس کی از سر نو تنظیم کی گئی اور اسے انڈین سول سروس کا نام دیا گیا، اور تمام اعلےٰ عہدوں کو اس میں شامل کر لیا گیا، اور اس وقت سے اس ملازمت کے تمام امیدوار

---

[۱] دیکھو قانون حکومت ہند کا تیسرا ضمیمہ۔

ایک عام امتحان مقابلہ کے ذریعہ جو لندن میں ہوتا بھرتی کئے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی بعض اعلیٰ عہدوں کو ایک صوبہ داری سول سروس میں شامل کردیا گیا ان عہدہ داروں کا تقرر ہندوستان میں ہوتا، اور یہ گویا ہندوستانیوں کے لئے مخصوص سمجھی جانے لگیں[1]۔ کبھی کبھی اس صوبوی ملازمت کا کوئی نوکر، اپنی اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے اس جگہ تک بھی ترقی کرجاتا ہے، جو انڈین سول سروس کے اراکین کے لئے مخصوص ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں دارالعوام نے یہ تجویز منظور کی کہ انڈین سول سروس کی بھرتی کے لئے انگلستان و ہندوستان دونوں جگہ ساتھ ہی ساتھ امتحانات مقابلہ لئے جائیں[2]، لیکن عملی دوسرے اعتراضات کی وجہ سے اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

اب اس حکمت عملی کے مطابق کہ تمام شعبہ جات حکومت میں ہندوستانی عنصر بڑھایا جائے، یہ طے کرلیا گیا ہے کہ انڈین سول سروس میں ہندوستانیوں کے داخلہ کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، جائینٹ رپورٹ[3] کی سفارشیں زیادہ تر پبلک سروس کے رائل کمیشن کی سفارشوں[4] پر مبنی ہیں اور بعض امور میں تو ان

---

[1] پبلک سروس کمیشن کے لئے جو اعداد و شمار یکم اپریل ۱۹۱۳ء کو انڈین سول سروس کی ملازمتوں کی تعداد کے متعلق بنائے گئے تھے یہ ہیں:-

	یورپین	ہندوستانی	میزان
انڈین سول سروس	۱۳۰۸	۶۳	۱۳۷۱
(یعنی فیصدی)	۹۵	۵	۰
صوبہ داری سول سروس	۲۰۹	۲۲۲۳	۲۴۳۲
(یعنی فیصدی)	۹	۹۱	۳۸۰۳

[2] ۱۸۶۰ء میں وزیر ہند نے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے بھی اس وقت اسی تجویز کی سفارش کی تھی۔

[3] دیکھو پارہ ۳۱۷۔

[4] پبلک سروس کمیشن ۱۹۱۲ء میں مقرر ہوا اور ۱۹۱۵ء میں اس نے اپنی رپورٹ مکمل کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان حالات کو جانچکر رپورٹ کرے کہ وہ کیا رکاوٹیں ہیں، جو غیر یوروپی اشخاص کے داخلہ ملازمت میں پیدا ہوتی ہیں۔

سفارشوں پر اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً ہر سال میں جس قدر تقرر ہوا کریں گے ان میں ہندوستانیوں کے لئے ایک خاص تعداد مخصوص کر دی گئی ہے۔ ابتداءً یہ تعداد ۱/۳ ہو گی، اور یہ رفتہ رفتہ اس طرح بڑھیگی، کہ ۱۰ سال کے عرصہ میں ۱/۲ تعداد تک پہونچ جائیگی۔ ہندوستانیوں کو مختلف طریقوں سے بھرتی کیا جائے گا، مثلاً (۱) اس عام امتحان مقابلہ کے ذریعہ جو اب تک لندن میں ہوتا ہے (۲) ایک امتحان مقابلہ کے ذریعہ جسے پبلک سروس کمیشن ہندوستان میں منعقد کرے گا (۳) ہندوستان میں نامزدگی کے ذریعہ (۴)[۴] ذیلی ملازمت سے ترقی دے کر جیسا کہ ابتک ہوتا آیا ہے (۵) ایسے قانون دانوں کا جنھوں نے ہندوستان ہی میں پیشہ قانون میں خاص شہرت حاصل کی ہے، محکمۂ عدالت کے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرکے۔

دوسری اعلےٰ ملازمتوں میں بھی اس قسم کی حکمت عملی پر عمل کیا جا رہا ہے، پبلک سروس کمیشن کی رپورٹ کے وقت ہندوستانی تعلیمی ملازمت میں ۴/۵ اسامیوں پر یوروپی مقرر تھے، آئندہ سے ۱/۲ اسامیاں، ہندوستانیوں سے پر[۵] کیجائینگی، ان کا تقرر ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ ہو گا، اور براہ راست تقرری و ترقی کے ذریعہ لوگ ان درجوں تک پہنچا لے جائیں گے۔ اسی طرح اگر لایق امیدوار مل گئے تو ہندوستانی جنگلاتی ملازمت میں بھی ۱/۲ اسامیاں ہندوستانیوں سے پر کی جائینگی۔ ہندوستانی کوتوالی ملازمت میں ابھی کچھ عرصے تک اس بات کی ضرورت ہے

ف۴ جن لوگوں کو ترقی دی گئی، ان کو عہدہ جات مندرجۂ فہرست پر مقرر کیا گیا ان عہدوں کے متعلق قواعد سنہ ۱۸۹۲ء ہی میں بنائے گئے، اور سنہ ۱۹۲۰ء میں ان پر نظر ثانی کی گئی جمعیت مقننہ کی ایک تحریک کی حکومت نے مخالفت کی جس میں ان جگہوں کو نہ صرف بڑھانے بلکہ مضاعف کرنے کی تجویز کی گئی تھی، مگر ۱۷ ر فروری سنہ ۱۹۲۱ء کو حکومت کو ۴۳ کے مقابلے میں ۶۸ راؤں سے شکست ہوئی۔

ف۵ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء میں جمعیت مقننہ میں حکومت کی طرف سے جو بیان پیش کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہی کہ (برہما کو نکال کر) ہندوستانی تعلیمی ملازمت میں ہندوستانیوں کا تناسب ۲۶ء۳ فی صدی ہے، اور اس سے پتہ چلتا ہے، کہ جدید حکمت عملی پر نہایت سختی سے پابندی کی جا رہی ہے۔ ہندوستانی ملکی ملازمت میں ان کا اوسط سنہ ۱۹۱۳ء کے ۵ فی صدی کے مقابلہ میں اس وقت ۱۳ فی صدی ہے۔

کہ برطانوی عنصر غالب رکھا جائے، اور اس وقت ہندوستانیوں کی بھرتی کا تناسب ۱/۳ ہے، جس میں سے نصف براہ راست اور نصف صوبہ واری کوتوالی کی ملازمت سے ترقی دے کر بھرتی کی جائیگی، اس کے علاوہ بہت سی ایسی ملازمتیں ہیں جن میں اب برطانوی عنصر کی بالکل ضرورت نہیں ہے، اور اب یہ ملازمتیں خالصتہً ہندوستانیوں سے پر کیجائیں گی اس قسم کی ملازمتوں میں محکمۂ مالیات، محکمۂ امور عامہ کا شعبۂ تعمیرات راہ و عمارات ہیں۔

ہندوستانیوں اور انگریزوں کے تناسب کی بحث و تنقید کے ساتھ دوسری جس چیز پر تنقید کیجاتی ہے وہ اعلیٰ اسول سروس کے فرائض کی انجام دہی کا مسئلہ ہے، اور یہاں پر ہم عاملانہ و عدالتی فرائض کی جداگانہ حیثیت پر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ حاکم ضلع جو ایک ہندوستانی ضلع کا عاملانہ افسر ہوتا ہے، فرانسیسی صوبہ کے پریفکٹ کے تقریباً مساوی ہے، اور اپنے عاملانہ فرائض کے علاوہ بعض عدالتی فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ دیوانی عدالتوں کا نظام سول سروس کا ایک جداگانہ شعبہ ہے، اس کے ساتھ ہی فوجداری عدالتوں کا کام عاملانہ افسروں اور محکمۂ عدلیہ میں منقسم ہے۔ حاکم ضلع پولیس کی نگرانی رکھتا ہے؛ وہی سب سے بڑا عامل ہے، اور عموماً (اپنے نائب عاملوں کے ذریعہ) فوجداری کے مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہی اہم قسم کے مقدمہ کو سشن جج کے پاس بھیجتا ہے۔ صرف کلکتہ، بمبئی، اور مدراس کے شہروں میں فوجداری عدالت بالکل الگ ہے، اور یہ ایک عدالتی افسر (جو پریسیڈنسی مجسٹریٹ کہلاتا ہے) اور عدالت عالیہ میں منقسم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہی افسر ضلع کے ہاتھوں میں عاملانہ و عدالتی کاموں کا رہنا، بہت ہی قابل اعتراض ہے، کیونکہ جب ایک شخص جو کہ پولیس کا نگراں ہونے کی وجہ سے مقدمات کے چلانے کا ذمہ دار ہے، (خواہ یہ کام ایک ماتحت افسر ہی کے ذریعہ کیوں نہ انجام پائے) تو اسی کے قبضے میں ان کا فیصلہ نہ ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ کی اس صورت کو ایک درخواست میں نہایت پرزور طریقہ سے بیان کیا گیا ہے، جو ۱۸۹۹ء میں وزیر ہند کو عدالتی و عاملانہ فرائض کی علیحدگی پر دی گئی تھی۔ اس درخواست پر بنگال و بمبئی کے سابق چیف جسٹسوں کے

دستخط بھی تھے۔ دوسری طرف حکومت کا بیان ہے کہ اس میں روپیہ کی بچت ہوتی ہے اور حاکم ضلع کو عامل اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے جو خاص وقار حاصل ہوتا ہے وہ دوسری صورت میں جاتا رہیگا۔ اور ہندوستان کے بعض ضلعوں میں تو اگر حاکم ضلع عامل اعلیٰ نہ رہا، تو اس کی وہ عزت ہی باقی نہ رہیگی۔ ہم اب شاید اس نتیجہ پر اس بحث کو ختم کر سکتے ہیں، کہ ایک تمام تر آزادانہ و مکمل محکمۂ عدالت کی ترتیب کو ایک لامعلوم عرصے تک ملتوی نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن یہ سوال کہ ہندوستان کی موجودہ ارتقائی حالت میں اس کا وجود بساضروری یا صرف مناسب ہے ایک مستقل سوال ہے۔ نہ صرف مجلس مقننہ کے دونوں ایوان بلکہ تمام صوبوں کی مجالس مقننہ میں اس موضوع پر بحث ہو چکی ہے۔ مدراس کے علاوہ تقریباً تمام مجالس عدالت و عاملی فرائض کی علیحدگی پر متفق ہیں، اور انھوں نے اپنے اپنے یہاں اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کمیٹیاں مقرر کر دی ہیں۔ حکومت ہند نے اگرچہ مقامی حکومت کے اختیار تمیزی میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی علیحدگی کے اصول کو بھی تسلیم کر لیا ہے اور اس پر رضامندی ظاہر کی ہے کہ اگر صوبوی حکومت اس قسم کا کوئی نظام مرتب کر کے اس کے اخراجات کا سامان کرے، تو وہ جماعت مقننۂ ہند میں اس کے متعلق تحریک پیش کرنے میں معاون ہوگی علیحدگی میں سب سے بڑی رکاوٹ مالی مشکلات کی ہے۔

جس طرح سول سروس کے عہدہ داروں کے متعلق مختلف مسائل پیدا ہوے ہیں بالکل اسی طرح ہندوستانی فوج کے اعلیٰ عہدوں کے متعلق بھی مختلف امور زیر بحث ہیں۔ جنگ سے پہلے ان تمام عہدوں پر برطانوی اشخاص فائز ہوتے تھے۔ یہاں پر یہ بات بتا دینا چاہئے کہ ہندوستان میں فوج میں برطانوی و ہندوستانی

لہ یہ مسٹر جسٹس (اب سر) عبدالرحیم رکن پبلک سروس کمیشن کی اقلیت کی رپورٹ میں شامل ہے۔ ۱۹۰۸ء میں حکومت ہند اس مسئلہ کی طرف ملتفت ہوئی تھی لیکن اس وقت جو حل پیش کیا گیا تھا، اس کو مقامی حکومتوں نے منظور نہیں کیا۔ اس کے بعد لارڈ ہارڈنگ کی حکومت نے بھی اس مسئلہ کو اٹھایا لیکن کوئی بہتر نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

فوج کا تناسب ۱ : ۲ ہے برطانوی فوجی عہدہ دار عموماً مستقل برطانوی فوج سے لئے جاتے ہیں۔ وہ وقتی طور پر سپہ سالار اعظم ہند کے ماتحت ہوتے ہیں، اور ان کی تنخواہیں بھی ہندوستان کے خزانہ سے دیجاتی ہیں۔ مؤخرالذکر فوج، ہندوستان کی "حربی" اقوام سے بھرتی کیجاتی ہیں (مثلاً سکھ اور دوسرے پنجابی، راجپوت، اور مرہٹہ اور نیپال کے گورکھا) اب سے پہلے کوئی ہندوستانی بھی والسرائے کے کمیشن سے بلند تر عہدہ پر مقرر نہیں ہوتا تھا؛ یہ عہدہ برطانوی کمیشن افسر سے نیچے اور ہندوستانی غیر کمیشن افسر سے اوپر بین بین ہے۔ جنگ کے ساتھ اس میں تبدیلی واقع ہوئی یعنی پچاس سے زیادہ ایسے اشخاص کو جنھوں نے میدان جنگ میں کارہائے نمایاں کئے تھے، شاہی کمیشن ملے۔ اب اختتام جنگ کے بعد سے ہر سال ہندوستان کی حربی اقوام کے ۱۰ نوجوانوں کو انگلستان کے مدرسۂ حربی سینڈہرسٹ کے لئے منتخب کیا جاتا ہے، کہ وہ وہاں سے کامیاب ہوکر ہندوستانی فوج میں کمیشن عہدوں پر مقرر ہوں[1]۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں (افواج ہند کی) ایشر کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کرتے ہوئے جمعیت مقننۂ ہند نے یہ تجویز منظور کی کہ آئندہ سے ان شاہی کمیشن عہدوں میں جو سالانہ ہندوستانی فوج کے افسروں کو ملتے ہیں، ۲۵ فیصدی عہدے ہندوستانیوں اور اینگلوانڈین افسروں کو ملیں۔ اس تعداد میں سنڈہرسٹ کے سالانہ امیدوار، اور وہ افسر جن کو والسرائے کے کمیشن عہدوں سے ترقی ملتی ہے، دونوں شریک ہیں۔ حکومت نے اس تجویز کی مخالفت نہیں کی، لیکن صورت حالات کے غائر مطالعہ تک کے لئے اس کو عملی جامہ پہنانے سے ملتوی رکھا گیا ہے۔

یہ ایک نہایت ہی نازک و اہم مسئلہ ہے۔ ایک طرف تو ایسے نوجوان ہندوستانی ملنا ذرا دشوار ہیں جو اپنے ذاتی اوصاف کی وجہ سے اس ملازمت کے لئے مناسب ہوں[2]، بلکہ اس میں بھی شبہ ہے، کہ ہم نسل یا ہم طبقہ

---

[1] اس سال ۱۹۲۲ء ولیعہد برطانیہ نے ڈیرہ دون میں انگریزی پبلک اسکول کے قسم کے ایک مدرسہ کا افتتاح کیا یہاں کمشنڈ یا لااقوام ہندوستانی لڑکے اس قسم کی تعلیم حاصل کرسکتے ہیں، جو ان کو بعد میں سینڈہرسٹ میں داخل ہونے کے لائق بنادیگی۔

[2] وہ ہندوستانی افسر جو والسرائے کا کمیشن پاچکے ہیں اور عام ہندوستانی سپاہی اپنے زیر کمان افسر کی شخصیت اخلاقی حالت سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔

افسروں کے علاوہ اور ایسے کتنے آدمی مل سکتے ہیں، جن میں صحیح جماعتی یکجہتی ممکن ہو۔ اور یہی چیز تمام رجمنٹی نظاموں کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ ممکن ہے کہ اس مسئلہ کا حل اس شکل میں ہو کہ ہندوستانی فوج میں تمام تر ہندوستانی افسر ہی ہوں اس قسم کا انتظام افواج خدمت شاہی (امپیریل سروس ٹروپ) میں ہے، یہ فوجیں بعض بڑی بڑی ہندوستانی ریاستوں سے متعلق ہیں، اور برطانوی فوج کی ایک امدادی شاخ ہیں۔ اسی طریقہ سے ایک خالص اسم بامسمیٰ قومی فوج کی بنیاد بھی ڈالی جائیگی[1]۔ یہاں پر ہم کو ان امکانی مشکلات کا بھی (جن کا سول سروس کے سلسلہ میں بھی مقابلہ کرنا ہوگا) ذکر کر دینا چاہیئے جو موجودہ تبدیل شدہ حالات میں قابل برطانوی افسروں کے حصول میں پیش آئینگی۔ اس مشکل کا ایک حل جو اگرچہ کامل طور سے تشفی بخش نہیں ہو سکتا، یہ ہو سکتا ہے کہ برطانوی افواج کے افسروں کا ہندوستانی افواج میں تبادلہ کیا جائے، اور اسی طرح ہندوستانی افسروں کا برطانوی افواج میں، یہی حل طبی محکموں یعنی رائل آرمی میڈیکل کور و انڈین میڈیکل سروس[2] (ہندوستانی طبی ملازمت کے انتظام کا بھی ہو سکتا ہے[3]) یہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں، ہندوستان کی فوج کی، ایشر کمیٹی کی رپورٹ میں بحث کی گئی ہے[4]۔ لارڈ چیمسفورڈ کی حکومت نے جو ایک نئی بات رائج کی تھی، وہ بھی قابل غور ہے، کہ اس سے جنگ کی پیدا کردہ روح جدید کا پتہ چلتا ہے، وہ نئی بات یہ تھی کہ ہندوستانی فوج کا ایک ممتاز ہندوستانی افسر بھی وائسرائے کی مجلس مقننہ کے لئے، نامزد کیا گیا اور بقول جائینٹ رپورٹ[5] کے اس کا مقصد یہ تھا کہ "اس ہندوستان کی اعلیٰ ترین مجلس

---

[1] یہ حکمت عملی جواب "ہندیانے" Indionization کے نام سے موسوم ہے روز بروز مستحکم ہوتی جاتی ہے، اور اس کا ثبوت اوس جواب سے ملتا ہے جو ۱۰ جنوری ۱۹۲۲ء کو جمعیت مقننۂ ہند میں دیا گیا تھا۔

[2] گزشتہ دو سال میں انڈین میڈیکل سروس میں جتنے امیدوار بھرتی کئے گئے ہیں ان میں ۲/۳ ہندوستانی ہیں۔

[3] اس رپورٹ سے متعلق جو مباحثہ ایوان مقننۂ ہند میں ۲۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو ہوا تھا اس کی روداد بھی پڑھو۔

[5] دیکھو پارہ ۳۲۹۔

میں ہندوستانی فوج کو نمائندگی کا حق مسلمہ ہو جائے گا۔"

قوانین اسلحہ ہند میں ترمیم کی وجہ سے ایک دیرینہ شکایت مٹ گئی۔ اس شکایت کا یہ سبب تھا، کہ اس قانون میں یہ نسلی امتیاز رکھا گیا تھا کہ یوروپی اصحاب کو آتشی اسلحہ رکھنے کے لئے کسی حاکم ضلع کی منظوری کی ضرورت نہ تھی؛ اب یہ مخصوص مراعات واپس لے لی گئی ہے، اور اب اس قانون کے لحاظ سے ہندوستانی یوروپی ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔

علاقہ والی افواج" جنھوں نے افواج مدافعت ہند کے شعبۂ رضا کاران ہند کی جگہ لے لی ہے جو دوران جنگ میں عالم وجود میں آئی تھیں بہت کچھ ریاستی افواج سے مشابہ ہیں۔ ہندوستانیوں کو عرصے سے اس بات کی شکایت تھی، کہ ان کو کسی قسم کی کوئی ایسی فوجی تعلیم نہیں دیجاتی ہے، کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کر سکیں تاہم دوران جنگ میں افواج مدافعت ہند کی ہندی شاخ کی بھرتی بہت ہی مایوس کن تھی ہندوستانی فوج کی اس جدید شاخ میں سب سے امید افزا جماعتیں جامعاتی پلٹنوں کی ہیں، اور امید ہے کہ کمیشن والے ہندوستانی افسروں کے لئے یہ بہترین تربیت گاہ ثابت ہوگی افواج مدافعت ہند کی ایک اور شاخ جو دوران جنگ میں عالم وجود میں آئی یوروپی اور انگریزی اینگلو انڈین لوگوں کی پلٹن تھی، جن کے لئے مدافعت وطن کی فوج میں داخلہ لازمی تھا؛ اس پلٹن کو اب امدادی افواج کے اصول پر رضا کارانہ طریقہ پر پھر از سر نو مرتب کیا گیا ہے، اور اس میں قابل داخلہ اشخاص کی بڑی تعداد شامل ہے۔

اس وقت بحری فوج کے حقیقی معنی کے لحاظ سے، ہندوستان اس فوج سے محروم ہے۔ امیر البحر لارڈ جیلیکو نے حال ہی میں تجویز پیش کی ہے، کہ موجودہ چھوٹی سی مقامی بحری قوت کو جو شاہی ہندوستانی بیڑے کے نام سے موسوم ہے، اور جو زیادہ تر صرف رسل و رسائل کی خدمت انجام دیتی ہے، ترقی دیکر ہندوستانی بحری قوت کے درجہ تک پہنچا دیا جائے، مگر موجودہ فوجی اخراجات کے ہوتے ہوئے، جو ہندوستان اپنی برّی مدافعت کے لیے برداشت کرتا ہے، اس وقت یہ ناممکن ہی معلوم ہوتا ہے، کہ ہندوستان اس تجویز کو خواہ وہ کسقدر

بھی حوصلہ افزا ہو، عملی جامہ پہنا سکے۔ اس وقت وہ تمام رقم جو بحریات کے نام سے عام طور پر سالانہ ہندوستان میں صرف کیجاتی ہے، تقریباً نصف ملین پونڈ ہے، اس میں ایک لاکھ پونڈ کی وہ رقم بھی شامل ہے، جو ہندوستان برطانوی محکمۂ بحری کو ادا کرتا ہے وہ جس کے ذریعہ سے شاہی بحری قوت کے شرقی ہند کے بیڑے کے چند جہازوں کے اخراجات برداشت کرتا ہے، اور یہ جہاز حکومت ہند کی رضا کے بغیر ایک مخصوص حدود سے باہر استعمال نہیں کئے جا سکتے ۔*

اس عہد جدید میں ہندوستان کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح عوام کی جہالت دور کی جائے اور جدید انتخاب کنندوں کی سیاسی تعلیم کیسے ہو اعداد پر ایک سرسری نظر اس کی اہمیت کو دلنشین کر دیتی ہے۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے یہاں کی جملہ آبادی کا ۶ فیصدی حصہ اور افراد ذکور میں ۱۰ فیصدی حصہ ایسا ہے کہ جس کو خواندہ کہا جا سکتا ہے۔ حال کے سرکاری اعداد کے مطابق مدرسہ جانے کی عمر (۵ سے ۱۰ سال) کے لڑکوں میں سے ہر تین میں ایک ابتدائی تعلیم پاتا ہے، اور اس عمر کی لڑکیوں میں سے ہر پندرہ میں ایک۔ لڑکیوں کی تعلیمی پستی کا سبب ایک حد تک وہ معاشرتی قیود ہیں، جن کے ذریعہ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں عورتوں سے پردہ کرایا جاتا ہے اور گو اب اس رسم کی سختی میں کچھ کمی ہو رہی ہے لیکن یہ نہایت ہی آہستہ آہستہ ہو رہا ہے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے، کہ یہاں کے برطانوی حکام نے سیاسی اسباب کی بنا پر ہندوستان کو تعلیم سے محروم کر رکھا ہے۔ جس معنی میں یہ الزام لگایا جاتا ہے، اس لحاظ سے یہ بالکل ہی غیر منصفانہ ہے۔ واقعہ یہ ہے، کہ یہ صرف اوسط طبقہ ہی ہے، جو اپنے اندر سیاسی رجحان بھی رکھتا ہے، اور جس نے صحیح طور سے تعلیم کی خواہش کا اظہار کیا ہے، ان کا مطالبہ تعلیم سیاسیات سے زیادہ معاشیات کی بنا پر ہے، اور ان کے اس مطالبہ کو نہایت فراخ دلی سے پورا کیا

*۔ اس کتاب کے لکھے جانے کے بعد ہندوستانی بیڑے کی ایک علٰحدہ شخصیت کر دی گئی ہے اور بمبئی کے بندرگاہ میں ایک جہاز ہندوستانیوں کو تجارتی جہازوں کی کپتانی سکھانے کے لئے متعین کر دیا گیا ہے۔

گیا ہے۔ اگر ہم ثانوی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں اور اس میں لڑکوں کی تعلیم کا حال دیکھیں، تو ہم کو نظر آئیگا، کہ ہر ۱۰۰۰ میں ۹ ثانوی تعلیم پاتے ہیں، اور یہ خود انگلستان کے تناسب سے کافی زیادہ ہے[1] تقریباً یہی حکم کالجوں پر بھی لگایا جا سکتا ہے اس وقت برطانوی ہندوستان میں ۱۱ جامعات* ہیں، اور ۱۵۰ کالجوں پر مشتمل ہے اور بنگال جیسے صوبہ میں جو اس لحاظ سے خاص طور سے بڑھا ہوا ہے، ایسے لوگوں کا تناسب جو پورے اوقات تعلیم میں شرکت کرتے ہیں، انگلستان سے دس گنا زیادہ ہے[2]

اس الزام کو کہ حکومت نے ان لوگوں کو جن کے لئے تعلیم معاشی و سیاسی حیثیت سے مفید ہوتی، اس سے محروم کر رکھا ہے، نظر انداز کرنے کے بعد بھی اگر حکومت پر یہ الزام لگایا جائے کہ اس نے اس قدر آزادی و رواداری کے برتاؤ میں غلطی کی ہے تو بعید از انصاف نہ ہوگا اس کے نتیجے ہوئے ایک طرف غربا کی طرف سے غفلت برتی گئی، اور دوسری طرف اعلیٰ تعلیم کا اتنے وسیع پیمانے پر انتظام کیا گیا، کہ ہندوستان کے بعض حصص میں ایسے تعلیم یافتہ اشخاص کی اتنی بڑی جماعت پیدا ہو گئی ہے کہ انکو اقتصادی حیثیت سے ملک اپنے اندر نہیں کھپا سکتا،

سنہ ۱۹۱۱ء میں مسٹر گوکھلے نے حکومت پر اس بات کا زور ڈالا کہ وہ ابتدائی تعلیم کا ذراہمت سے انتظام کرے، اور پھر مجلس مقننۂ ہند میں یہ تحریک پیش کی کہ تمام برطانوی ہند میں ابتدائی تعلیم لازمی قرار دیجائے۔ مالی اسباب کے اعتبار سے حکومت اس تحریک کو قبول نہ کر سکی، لیکن گزشتہ دس برس میں مسٹر گوکھلے کے خیال کے موافق کافی ترقی ہو گئی ہے۔ اکثر صوبوں میں ایسے قوانین منظور کر لئے گئے ہیں، جن کے ذریعہ اگر مجالس بلدیہ چاہیں تو اپنے حلقوں میں لازمی تعلیم جاری کر سکتی ہیں،

---

[1] دیکھو ہند ۱۹۲۰ء میں اخلاقی و مادی ترقی کی رپورٹ صفحہ ۱۶۳۔
[2] ایضاً　　ایضاً　　ایضاً

* یہ تعداد بڑھ کر اب ۱۹۲۹ء میں ۱۷ تک پہونچ گئی ہے۔

اور صوبۂ بمبئی میں تو یہاں تک کر دیا گیا ہے کہ جو مجالس بلدیہ اس قسم کی کوئی کارروائی کرنا چاہیں وہ نصف اخراجات صوبہ کی حکومت سے لے سکتی ہیں۔ عام تعلیمی توسیع کی ابتدا کے لئے دو مشکلوں کے دور کرنے کی سخت ضرورت ہے، اولاً مالی (اور ہندوستان جیسے غریب ملک میں یہ وہ مشکل ہے جس سے معاشری مصلحین کو قدم قدم پر دوچار ہونا پڑتا ہے) اور ثانیاً تربیت یافتہ معلمین کا فقدان کہ یہ مشکل بھی اسی قدر سخت ہے۔ اس وقت تمام شعبہ جات تعلیم میں صرف ایک ثلث ایسے اساتذہ ہیں، جنھوں نے کسی نہ کسی قسم کی تعلیمی تربیت پائی ہے۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ اب جب کہ محکمۂ تعلیم کو حکومت خود اختیاری مل چکی ہے۔ اس مسئلہ کے لئے تمام مساعی کا دارومدار ہندوستانی وزرا پر ہے، اور اس کے متعلق جو بھی لائحہ عمل اختیار کیا جائے اس کے اخراجات قابل حصول صوبوی رقموں اور ایسے مزید محصولوں کے ذریعہ پورے کئے جا سکتے ہیں جو عموماً مقامی طور سے وصول کئے جائیں گے۔

ابتدائی تعلیم کی توسیع کے مسئلہ کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کے صنعتی ارتقا کا سوال ہے۔ تعلیم کی طرح یہ بھی ایک ایسا سرکاری محکمہ ہے جسے صوبوی محکمہ بنا کر ذمہ دار ہندوستانی وزرا کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ انڈین انڈسٹریل کمیشن ماموریہ متعلق صنعت ہند) ۱۶-۱۹۱۶ء کی قابل قدر و مفصل رپورٹ کی بنا پر ہر صوبہ میں ایک ناظم صنعت مقرر ہو چکا ہے۔ یہ ناظم وزیر صنعت و حرفت کے ماتحت حکومت کے جملہ فرائض انجام دے گا۔ اور لوگوں کو جدید صنعت و حرفت کے لئے ترغیب مشورہ اور امداد دیے گا۔ حکومت کے قدیم اصول غیر مداخلت کے خاتمے کا نتیجہ شخصی کاروبار کی ترقی میں نمایاں ہوا ہے، اور دوران جنگ میں اون کو مزید وسعت و قوت حاصل ہو گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان نہایت سرعت سے ایک صنعتی ملک بن رہا ہے۔ اور اگرچہ اس راہ میں بعض رکاوٹیں بھی ہیں، لیکن پھر بھی نہ صرف ہندوستان کی غربت مختلف اقسام کے صنعتوں اور حرفتوں کی ترویج اور مصنوعات کے لئے منفعت بخش بازاروں کی تخلیق کے ذریعہ سے دور کرنے کے لئے و نیز باشندگان ملک میں اجتماعی و سیاسی ذہانت پیدا کرنے کے لئے

اس سے مفر نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تعلیم و صنعت کو دوش بدوش ترقی کرنا چاہئے! ان میں سے ایک کا دوسرے پر ردعمل ہوتا ہے یعنی صنعتی ترقی جس کے ساتھ اجتماعی ترقی لازمی ہے۔ ایک طرف تو تعلیم کا مطالبہ پیدا کرتی ہے، اور دوسرے مزید مادی ذرایع سے اس مطالبہ کی تکمیل کا سامان مہیا کرتی ہے۔

اگرچہ یہ سب کچھ صحیح ہے، پھر بھی ابھی عرصۂ دراز تک ہندوستان دیہات اور چھوٹے گیاؤں ہی کا ملک ہونے پر مجبور ہے۔ اور ان کی سیاسی تعلیم محض ابتدائی تعلیم کی توسیع کا مسئلہ نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے دیہات میں عمومیت کی جڑ مضبوط کرنا ضروری ہے تو اس کو صرف ملک کے حسب حال مجالس کے ذریعہ کرنا چاہئے، اور دیہاتی پنچایت[1] اسی قسم کی ایک مجلس ہے۔ دیہات کی ان پنچایتوں کو زندہ کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ پنچایت کا نظام دیہات اور مختلف ذاتوں دونوں میں پایا جاتا ہے۔ جماعت انتخابی ہوتی ہے، اس کے پانچ ارکان ہوتے ہیں، جو پنچ کہلاتے ہیں، اور ان کا صدر سرپنچ۔ یہ نظام تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ عہد برطانیہ کے ابتداہی میں کچھ تو نظام حکومت کی مرکزیت کی وجہ سے اور کچھ دیہات کے معاشی علٰحدگی کے خاتمہ کی وجہ سے اس نظام کو زوال آیا لیکن اب اس کے احیا کی سخت کوشش کرنا چاہئے، اور یہ نہ صرف اس لئے کہ مقامی معاملات کی لامرکزیت کا یہ بہترین ذریعہ ہوگا بلکہ عملی عمومیت کے لئے یہ تجربہ گاہ مفید ثابت ہوگی۔ دیہات کے قدیم نظام حکومت کی خود اختیاری کے بحال کرنے میں مدراس سب سے آگے ہے۔ بنگال نے بھی حال میں حکومت خود اختیاری دیہہ کا قانون بالکل اسی طرز پر منظور کیا ہے، اور دوسرے صوبے ان کی تقلید کر رہے ہیں۔ اس کے جو طریقۂ عمل اختیار کیا گیا ہے یہ ہے کہ متعدد متصل دیہات کے مجموعہ کو ایک ایسی انجمن کے ماتحت کر دیا جاتا ہے، جو اس علاقہ کا اچھی طرح انتظام کر سکے، مگر اس کے ساتھ

---

[1] اس کے علاوہ ایک چیز امداد باہمی کے بنک ہیں جو سال بسال ہندوستان کی دیہاتی زندگی میں وسعت اختیار کرتے جاتے ہیں۔

یہ بھی خیال رکھا جاتا ہے، کہ یہ علاقہ اتنا بڑا نہ ہو جائے، کہ مقامی رنگ غائب ہو جائے اس علاقہ کو ایک ایسی انجمن مجلس، یا پنچایت کے ماتحت دیا جاتا ہے، جس کے اکثر ارکان منتخب ہوتے ہیں۔ یہ پنچایت سڑکوں، آب رسانی، مدارس، شفاخانوں اور اس قسم کے مقامی معاملات اور حاکم ضلع کی زیر نگرانی دیہاتی پولیس کا انتظام کرتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے فوجداری اور دیوانی مقدموں، اور پنچوں کے ذریعہ فوری اور بلا خرچ تصفیہ بھی اصولاً اس نظام کا ایک جز ہے چونکہ اب محکمہ حکومت خود اختیاری ایک مستقل محکمہ ہو گیا ہے، اس لئے اس معاملہ کی طرف بھی ہندوستانی وزرا کی توجہ مبذول ہے۔

پس دوسرے محکموں کا ذکر ہی کیا صرف ان تین میدان ہائے عمل یعنی تعلیم، صنعتی ترقی، اور دیہاتی حکومت خود اختیاری میں، اصلاح شدہ مجالس مقننہ اور ان کے ذمہ دار ہندوستانی وزرا کو اس کے کافی مواقع حاصل ہیں۔ کہ وہ شہریت اور عمومیت کی وسیع و مضبوط بنیاد قائم کریں، اور اپنے تجربات کی روشنی میں نہایت بہادری سے اس کی تعمیر کرکے ان مسائل کو نہایت بہتر طریقے سے حل کرکے اپنے کو حکومت خود اختیاری کے مزید حقوق کا مستحق ثابت کریں۔

باب (۶)

اصلاح شدہ دستور حالت نفاذ میں*

اب جب کہ اصلاح شدہ دستور حکومت کی عملی زندگی کو عرصہ گزر چکا ہے، ہم اپنے اس عظیم آئینی تجربے کے بعض ابتدائی نتائج سے متعلق اظہار رائے کر سکتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم پارلیمنٹی مجالس کی کارروائیوں کی طرف متوجہ ہوں مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ ہم اس اولین انتخاب سے متعلق جو نومبر دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا کچھ کہیں۔ ہم اس امر سے واقف ہیں کہ بعض قوم پرستوں کے لائحہ عمل کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ انتخابات کا مقاطعہ کیا جائے۔ اس حکمت عملی کو بڑے بڑے قصبوں میں عموماً اور صوبہ متحدہ، پنجاب، اور بمبئی پریسیڈنسی میں خصوصاً زیادہ کامیابی حاصل ہوئی، جہاں تحریص و ترغیب کی متعدد کوششوں سے امیدواروں اور انتخاب کرنے والوں دونوں کو عملی حصہ لینے سے باز رکھا گیا۔ ایسی ۷۷ نشستوں میں سے جو انتخاب کے ذریعہ پر ہوتیں، صرف نصف درجن ایسی نشستیں تھیں جن کے لئے ابتداءً کوئی امیدوار پیش نہیں ہوا، چنانچہ ان جگہوں کو انتخاب ثانی کے ذریعہ بعد میں پر کیا گیا۔ اس کے علاوہ امیدواروں کے

* ملحوظ رہے کہ یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی تھی۔

اجتناب[1] اور اکثر ان رائے دہندوں کے احتراز کی وجہ سے جنھوں نے تحریک ترک موالات سے متاثر ہو کر رائے نہیں دی' ان جدید مجالس کی وہ شان نمائندگی پورے طور سے حاصل نہ ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی ۔

۷۴ نشستوں میں ۵۳۵ میں مختلف امیدواروں میں مقابلہ تھا' اور ہر نشست کے لئے اوسطاً ۲'۳ امیدوار پیش کئے گئے تھے' اور اگر ایسی نشستوں کے جن کے لئے مقابلہ تھا' تمام ملک کے رائے دینے والوں کا اوسط نکالا جائے اور پھر واقعی ان کا مقابلہ ان لوگوں کے اعداد سے کیا جائے جنھوں نے رائے دی تھی' تو مقامی مجالس' جمیعت مقننہ اور مجلس مملکت میں علی الترتیب ان کا اوسط ۳۱' ۲۵' اور ۵۵ ہو گا۔ یہ تعداد بہت بڑی ہوتی' مگر شہروں میں تحریک ترک موالات کا اثر غالب تھا۔ مدراس کے شہروں میں سب سے زیادہ رائیں دی گئیں' تمام غیر اسلامی شہری حلقوں میں اوسطاً ۵۰ فی صدی رائیں درج کرائی گئیں۔ ان میں ایسے دو حلقہائے انتخاب بھی شریک ہیں جن میں ۷۰ فیصدی رائیں درج ہوئیں۔ دیہاتی حلقوں میں جہاں کے نتائج شہروں سے زیادہ تشفی بخش تھے' بہار و اڑیسہ جیسے پسماندہ صوبہ میں' ۵۸' ۶۹' ۷۱ اور ۷۹ فی صدی رائیں درج ہوئیں اور صوبجات متحدہ میں تحریک ترک موالات کے باوجود ایک علاقہ میں سے ۶۶ فیصدی اور ۱ میں ۵۰ فیصدی سے زیادہ رائیں درج ہوئیں جب ہم ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہیں' کہ آسام' اور صوبجات متوسط اتنے ترقی یافتہ شمار نہیں کئے جاتے ساتھ ہی تحریک ترک موالات کا اثر بھی غالب تھا

---

[1] تمام صوبوں میں عموماً مسلمان امیدواروں کا خاص طور سے فقدان محسوس کیا جا رہا تھا' اور شہروں میں اور صوبہ بمبئی اور پنجاب میں خاص طور سے یہ بات زیادہ نمایاں تھی۔ ترک موالاتی جماعت نے جس مقاطعہ کی تحریک کو شروع کیا تھا' اسے مسلمانوں نے برطانیہ کے ترکی طرز عمل پر صدائے احتجاج کے طور پر اختیار کر لیا تھا۔ دیکھو اعداد و شمار متعلقہ نتائج انتخابات تمہیدی نوٹ مطبوعہ نمبر ۱۲۶۱۔

[2] وقتاً فوقتاً ترک موالاتی جماعت نہایت نیچ قوم کے کسی شخص کو

اور رائے دہندوں کو مقام اندراج رائے تک لانے میں طبعی مشکلات بھی تھیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ تمام انتخابی کارروائی ایک بالکل نئی چیز تھی تو معلوم ہوتا ہے، کہ صوبجاتی مجالس کے یہ اولین انتخابات کسی صورت سے بھی مایوس کن نہ تھے لیکن جمعیت مقننہ کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس صورت میں حلقہ جات انتخاب، بڑے بڑے ہیں لیکن اس کے متعلق جو رائے دہندے ہیں ان سے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے، کہ وہ اپنی ذمہ داری کو نہایت سنجیدگی سے محسوس کریں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ اولین ۱۰۴ انتخابی ارکان کے لئے تمام ملک میں ...،...،۲ رایوں سے بھی کم رائیں درج کرائی گئیں جس سے اس مجلس کی نمائندگی کی کیفیت کچھ زیادہ دلخوش کن نہیں معلوم ہوتی۔ مجلس مملکت میں زیادہ تر بڑے مالداروں اور زمینداروں کے مفاد کی نمائندگی کی جاتی ہے اور یہی جماعتیں اس کی حلقہائے انتخاب ہیں۔

اس حقیقت کو ذہن نشین رکھتے ہوئے، کہ تحریک ترک موالات کی وجہ سے ان مجالس کو مکمل نمائندگی کی حیثیت حاصل نہیں تھی، پھر بھی ان جدید مجالس کے ارکان کے متعلق کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام مجالس میں قانون پیشہ اصحاب کی معقول تعداد ہے، لیکن بعض صوبوں میں زمینداروں کی بھی خاصی تعداد موجود ہے، حالانکہ یہ جماعت اس وقت تک کچھ زیادہ نمایاں اور قوی نہیں ہے[۱]۔ ارکان کی ایک کثیر تعداد کے متعلق عموماً اور قانون پیشہ ارکان کے متعلق خصوصاً یہ بات کہی جاسکتی ہے، کہ ان کی وقعت "غیر قابلین" سے شاید ہی کچھ بہتر ہو۔ واقعہ یہ ہے، کہ ایک ایسے ملک میں جہاں امکانی ارکان کی تعداد اس قدر محدود ہو، اور جس کے حلقہائے انتخاب عموماً اسقدر منتشر و وسیع ہوں

(بقیہ حاشیہ متعلق صفحہ ۱۵۲) مصنوعی نمائندہ کے طور پر کھڑا کر دیتی، تاکہ ان جدید مجالس کی تذلیل ہو اس طرح ایک یا دو نشستوں پر قبضہ کیا گیا۔

[۱]۔ یہ جماعت تمام ملک میں عموماً اور بنگال، بہار و اڑیسہ اور صوبجات متحدہ میں خصوصاً انتخابات میں اپنی کامیابی سے مایوس تھی لیکن ان صوبوں میں ان کی نمائندگی بہت معقول ہے۔

وہاں ارکان اور حلقہائے انتخاب میں مفاد کی یگانگت کا ارتقا تدریجی طریقے سے ہوگا۔ اکثر جدید ارکان کی امور ملکی سے دلچسپی کا فقدان، اور یہ واقعہ کہ بعض ارکان اپنے وقت کی قربانی پر تیار اور راضی نہیں ہوتے، یہ وہ اسباب ہیں جو اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں، کہ بعض صوبوی مجالس مقننہ اور جمعیت مقننہ میں حاضریوں کی تعداد اتنی کم کیوں رہی ہے[1] کیونکہ ہندوستانی زندگی میں پارلیمنٹی مجالس کی کامیابی کے لئے ارکان کی دلچسپی اتنی ہی زیادہ ضروری ہے، جتنا کہ رائے دہندوں کے لئے سیاسی فہم، اور اس کی کوئی توقع نہیں ہے، کہ دونوں میں سے ایک بھی دفعۃً عالم وجود میں آجائے گی۔

بعض جدید مجالس میں خاص خاص مقاصد اور راہ نماؤں کی معرفت سیاسی فریق بندی کی جاچکی ہے، مثلاً بنگال کی مجلس مقننہ میں آزاد اعتدال پسند جماعت تقریباً پچاس غیر سرکاری ارکان پر مشتمل تھی، اور وہ حکومت کے مقابل سب سے بڑی جماعت ہے، صوبجات متحدہ میں اعتدال پسند و ارتقا پسند جماعتوں نے ایک متحدہ ارتقا پسند جماعت کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس میں تقریباً ۵۲ ارکان تھے جمعیت مقننہ میں بھی دو جماعتیں تھیں یعنی عمومی جماعت میں ۱۰۸ غیر سرکاری ارکان میں سے تقریباً ۵۰ ارکان شریک تھے۔ اس جماعت کے دو اہم مقاصد (۱) اخراجات میں کمی اور (۲) کامل سوراج کی طرف نہایت سرعت سے ترقی؛ دوسری "قوم پرور" فریق ہے۔ یہ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے کم اہم ہے، لیکن اس میں پارلیمنٹی ذہنیت کافی طور پر موجود ہے، اس کی عام حکمت عملی یہ ہے، کہ حکومت اور انتہائی تبدیلی پسند جماعت کے درمیان توازن قائم رکھے، اس کے لائحہ عمل کی ایک اہم دفعہ فوج اور ملکی ملازمتوں میں ہندوستانی عنصر کا اضافہ ہے۔

[1] مجلس مقننۂ بنگال کے ایک ابتدائی جلسے کی حاضری اتنی کم تھی، کہ جلسہ میں پیش ہونے والی ۸۰ تحریکوں میں سے ۱۰ ان کے محرک کی غیر حاضری کی وجہ سے پیش نہ ہوسکیں۔ بہار و اڑیسہ میں ارکان کی حاضری کی تعداد ۵۰ سے شاید ہی بڑھی ہو، اور یہ مجموعی تعداد کی نصف سے کم بھی ہے، اس کے ساتھ جمعیت مقننہ کے ایک اہم مبحث کے جلسہ میں ۱۱۸ ارکان میں سے صرف ۶۲ (۶۰ فی صدی سے بھی کم) ارکان موجود تھے۔

مدراس کی مجلس مقننہ سیاسی فریقوں کی بجائے مذہبی اقوام کے اصول پر منقسم تھی عام توقع کے خلاف پہلے ہی انتخابات میں غیر برہمنوں نے بہت زیادہ کامیابی حاصل کرلی، اور منتخب ارکان میں ان کی اکثریت مسلم ہوگئی۔[1] اسی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے گورنر نے مفوضہ محکموں کے انتظام کے لئے تینوں وزیروں کو غیر برہمن ارکان ہی میں سے منتخب کیا۔ گورنر کا یہ فعل "ذمہ دار حکومت کی تمام سابقہ نظائر کے عین مطابق تھا، کیونکہ وزراء سے اس بات کی توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ متفقہ طور سے اپنے فرائض انجام دیں، اور مجلس مقننہ میں ان کو اکثریت کی حمایت حاصل ہو، پھر بھی اس واقعہ سے ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، کیونکہ لوگوں کو عام حالات کی طرح اس وقت بھی یہی خیال تھا کہ گورنر سرکاری ملازمتوں کے اصول کے مطابق ان تینوں جگہوں میں سے ایک غیر برہمن کو، ایک برہمن اور ایک مسلمان کو سپرد کرے گا۔[2]

دوسرے صوبوں میں اکثر وزراء اعتدال پسند جماعت کے ارکان سے (جس نے اصلاحی اسکیم کی تائید کی تھی) لئے گئے تھے اور وائسرائے کی مجلس عاملہ اور صوبہ کی مجالس عاملہ میں جو ہندوستانی ارکان مقرر کئے گئے، وہ بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے یہ وہ لوگ ہیں، جو منتظم آئینی ترقی کے خواہاں ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی پکے قوم پرست ہیں؛ یہ وہ لوگ ہیں جو عہدوں کو قبول کرنے کے ساتھ ہی اپنے اصول پر برابر قائم رہے ہیں اور عرصۂ دراز سے ہندوستانی سیاسیات میں خاص مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ پنجاب کے مقرر شدہ وزراء میں ایک آنریبل مسٹر ہرکشن لال[3] بھی تھے جو انتہا پسند سیاست داں تھے، ۱۹۱۹ء کے فسادات پنجاب کے سلسلہ میں

---

[1] غیر برہمن امیدواروں کے مفاد کی حفاظت کے لئے خاص انتظام کیا گیا تھا (دیکھو باب ۴ جزو ۴) نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کی ۷۴ انتخابی جگہوں میں سے ۵۴ پر انھوں نے قبضہ کرلیا۔ اس میں وہ ۲۸ نشستیں بھی شامل ہیں، جو ۶۵ غیر مسلم نشستوں میں سے ان کے لئے مخصوص ہیں

[2] گورنر کی مجلس عاملہ کے ہندوستانی ارکان میں ایک برہمن ہے، اور ایک مسلمان۔

[3] مسٹر ہرکشن لال پنجابی صنعت و حرفت کے خاص حلقۂ انتخاب کی طرف سے مجلس مقننہ پنجاب میں منتخب ہوئے تھے۔

ان کو سزا بھی مل چکی تھی، اور سال کے آخر میں اصلاحات کے نفاذ کے ساتھ ہی جو عام معافی دی گئی تھی، اس میں رہا ہوئے تھے۔ جس فیاضانہ تدبر نے اس تقرر کی ہمت دلائی اس کی وجہ سے لوگوں میں ایک عام اطمینان یہ پیدا ہو گیا۔

اب جدید پارلیمنٹی مجالس کی کارروائی کی طرف متوجہ ہو جیئے۔ ہم اصلاح شدہ مجالس مقننۂ ہند کے اولین اجلاس (فروری، مارچ ۱۹۲۱ء) ہی میں دیکھتے ہیں، کہ جدید مجالس مقننہ نے پرزور و سنجیدہ طریقے سے اور مفلوج مالی حالت کی وجہ سے حکومت جن افکار میں مبتلا ہو گئی تھی ان میں خلوص کے ساتھ شریک ہو کر ہمارے نزدیک ان حقوق کے صحیح استعمال کا ثبوت دیا جو اصلاحات کی وجہ سے ان کو ملے تھے۔

جمعیت مقننہ کے اولین اجلاس میں ۱۹۱۹ء میں پنجاب میں فوجی قانون کے نفاذ کے متعلق بحث ہوئی۔ اس تجویز کے ذریعہ گورنر جنرل با اجلاس کونسل سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ (۱) وہ اس بات کا اعلان کر دے کہ وہ مکمل نسلی مساوات کے اصول کی سختی سے پابندی کرے گا، اور ہندوستانی جانیں، اور عزت برطانوی جانوں اور عزت کی طرح مقدس سمجھی جائینگی، (۲) اس بات پر اظہار افسوس کرے کہ فوجی قانون کا اس طریقہ سے نفاذ کیا گیا تھا، جس سے ہندوستانی آبادی کے احساس خودداری کو سخت صدمہ پہنچا تھا، (۳) ایسے افسروں کو جنھوں نے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کیا ہے، عبرت انگیز سزا دیجائے اور (۴) خود اس بات کا اطمینان کرے، کہ جو لوگ جلیانوالہ باغ میں یا کسی دوسری جگہ مقتول یا زخمی ہوئے ان کے اعزا کو اسی نسبت سے معاوضہ دیا گیا ہے، جس جس نسبت سے ان یوروپینوں کو دیا گیا ہے جس کو فسادات کے دوران میں کوئی صدمہ پہنچا، یا مقتول ہوئے۔ محرک نے اس سرکاری بیان کے بعد کہ جن افسروں کا طرز عمل قابل الزام تھا ان کے خلاف کارروائی کی جا چکی ہے، اپنی تحریک کی تیسری دفعہ واپس لے لی؛ باقی دفعات کو حکومت نے قبول کر لیا، اور اس طرح سے ترمیم شدہ تجویز متفقہ طور سے منظور کر لی گئی۔ سرکاری و غیر سرکاری یوروپی ارکان نے نہایت صفائی سے ہندوستانی نقطۂ خیال کو تسلیم کیا اور اسی طرح سے ہندوستانی ارکان نے فضولیات

سے درگزر کر کے نہایت ہی صاف طریقہ سے اپنے زاویۂ نگاہ کو ظاہر کیا اور اس طرح اس تجویز کے متعلق جو تلخی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا وہ دور ہو گئی[1]

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں[2] ایک اور معاملہ جس کے متعلق ہندوستانیوں کو بعض نہایت تشدد آمیز قوانین کی وجہ سے سخت شکایت تھی۔ مجلس مملکت کے پہلے ہی جلسے میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی، اور مسٹر (اب رائٹ آنریبل) سری نواس شاستری نے تحریک کی، کہ ایسی ذیلی جماعت مقرر کی جائے، جو اس مسئلہ کی تحقیقات کرے۔ حکومت نے اس تجویز کو منظور کر لیا، اور ایک ہفتہ بعد خود حکومت نے جمعیت مقننہ میں اس مضمون کی ایک تحریک پیش کی، کہ ایک ایسی جماعت مقرر کی جائے، جو قانون مطابع کے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ ان دو ذیلی جماعتوں نے اپنی روداد یں پیش کیں جن میں زیر بحث قوانین کی تنسیخ کے موافق رائے دی۔ البتہ انھوں نے دو قانونوں کو اس وقت کے لئے جب تک کہ سیاسی حالات بہتر نہ ہو جائیں، قانونی صورت میں رہنے دینے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور اس طرح اس خوش فہمی کی راہ سے جس پر اس بڑی آئینی تجربہ کی کامیابی کی بنیاد ہے ایک اور رکاوٹ دور ہو گئی۔

---

[1] ڈیوک آف کناٹ نے مجالس مقننۂ ہند کے رسمی افتتاح کے وقت جو قابل یادگار الفاظ کہے تھے اس رواداری میں بہت کچھ ممد و معاون ہوئے۔ انھوں نے کہا تھا کہ "امرتسر کی سیاہی ہندوستان کے چہرے پر بدنما داغ لگائے ہوئے ہے۔ اس وقت میں ایک ذاتی درخواست کرنے پر مجبور ہوں اور یہ درخواست ان سادہ الفاظ میں ہو گی جو میرے دل سے نکل رہے ہیں، اور امید کرتا ہوں کہ ان کو سرد مہری و تنقید کے نذر نہ کر دیا جائے گا۔ میرا تجربہ مجھے بتاتا ہے، کہ غلط فہمی کے معنی عموماً جانبین کی غلطی کے ہوتے ہیں، ہندوستان کے ایک رفیق دیرینہ کی حیثیت سے میں ہندوستانیوں اور یوروپیوں دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ عہد گزشتہ کی تمام غلط فہمیوں اور غلطیوں کو ہمیشہ کے لئے دفن کر اس عفو کی جگہ عفو سے کام لیں، متحد ہو جائیں، اور ان توقعات کے حصول کے لئے جو آج پیدا ہو رہی ہیں ایک ساتھ مل کر کام کریں۔" [2] دیکھو صفحات ۵-۴۳ ماسبق۔

اصلاح شدہ مجالس مقننہ نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں ایک اور ایسے معاملہ کے متعلق بھی جس کا ہندوستان کے قومی مفاد اور خود داری پر گہرا اثر پڑتا ہے. اپنی رائے کا حکومت پر اثر ڈالا؛ یہ ہندوستان کی فوجی ضروریات سے متعلق تھا، اور ہندوستان کی فوج سے متعلق ایشر کمیٹی کی رپورٹ سے پیدا ہوا تھا کمیٹی کی روداد ۱۹۲۰ء کی خزاں میں شائع ہوئی تھی، لیکن حکومت نے اوس کی اہم سفارشوں کو اوس وقت تک عملی جامہ پہنانے سے روک دیا تھا، جب تک کہ جدید مجالس مقننہ اون پر غور نہ کرلیں، روداد کے بعض مبہم جملوں نے ہندوستانیوں کے جذبات کو برانگیختہ کر دیا تھا، مثلاً یہ کہ ہندوستان کا سپہ سالار برطانوی محکمۂ جنگ کا ماتحت ہوگا، اور ہندوستان ایک ایسی فوج تیار کریگا جو ہندوستان کی ضروریات کے بجائے شہنشاہی مدافعت کے ضروریات کے مطابق ہوگی، اور اسی کو اس فوج کے تمام اخراجات برداشت کرنا پڑینگے۔

اس موضوع پر جمعیت مقننہ کی دوسری نشست میں بحث ہوئی، اور مندرجہ ذیل ترمیم شدہ تجویز کو حکومت نے قبول اور مجلس نے متفقہ طور سے منظور کرلیا، "کہ ایشر کمیٹی کی رپورٹ میں جو کچھ بھی لکھا ہو، اوس کے باوجود ہندوستان کی فوج ہمیشہ ہندوستان کے ہی ماتحت ہوگی، اور انگلستان کے محکمۂ جنگ کے اقتدار یا مداخلت سے آزاد رہیگی، اور سلطنت برطانیہ کے مختلف حصص کے باہمی تعلقات سے متعلق جو اشتراک عمل ضروری ہوگا، اوس کے متعلق تمام امور ایسی کانفرنس میں طے پائینگے، جن میں ہندوستانیوں کی کافی نیابت ہوگی۔" اس مباحثہ کی دوسری منزل وہ تھی جب کہ ایک مرتبہ پھر حکومت کی منظوری اور اتفاق کے ساتھ جمعیت مقننہ کے ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی، جس کے ذمہ یہ کام دیا گیا، کہ وہ ایشر کمیٹی کی رپورٹ پر مجموعی طور سے غور کرکے سفارش کرے؛ بعد میں یہی سفارشیں تجاویز کی صورتوں میں ایوان کے سامنے پیش کی گئیں۔ ایشر کمیٹی نے یہ جملہ استعمال کیا تھا، "کہ ہندوستان کے حربی ذرائع کو اس طرح ترقی

دیجائے کہ وہ شہنشاہی ضروریات کے مطابق ہوں[1]"سرکاری خیال کے مطابق اس کے معنی یہ تھے، کہ "ہندوستان کی فوج کو ان طریقوں پر منظم و مسلح کیا جائے جن پر سلطنت برطانیہ کی دوسری افواج کو منظم و مسلح کیا جاتا ہے"[2] یوان نے اس تاویل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور اس فقرے کو ہی ساقط کر دیا جو ان کے جذبات مشتعل کئے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی طے کیا گیا کہ "شہنشاہی حفاظت کے متعلق تجاویز میں ہندوستانیوں پر جو ذمہ داریاں عائد کی جائیں گی، وہ کسی صورت میں بھی سوارا جی قلمروؤں کی ذمہ داریوں سے زیادہ سخت نہ ہوں گی اور ان ہی قلمروؤں کے شرائط کے مطابق عائد ہوں گی" اس کے علاوہ متعدد سفارشی تجاویز با ترمیم یا بغیر ترمیم بھی منظور ہوئیں، ان میں سے بعض کو حکومت نے رسمی طریقہ سے منظور بھی کر لیا، ان میں سے ایک سفارش جس کی طرف میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے[2] یہ تھی: کہ ہندوستان کی فوج میں کمیشن کا عہدہ اب پہلے سے زائد تعداد میں ہندوستانیوں کو دیا جائے۔

اس اجلاس کی دوسری خصوصیت مقننہ کی (اور یہاں ہماری مراد خاص طور سے جمعیت مقننہ سے ہے) وہ ذہنی سنجیدگی تھی، جس کے ساتھ وہ ایک طرف تو اپنے جدید مالی اختیارات کو کام میں لائے اور دوسری جانب حکومت کی مالی تجاویز کی دلی تائید کی۔

سنہ ۱۹۲۱ء کے مالی سال کی ابتدا میں وزیر مال نے دیکھا کہ سال مختتمہ میں ۱۱ کروڑ ۵۷ لاکھ روپے کی کمی ہے، اور موجودہ محاصل کی بنا پر آئندہ سال یہ کمی ۱۸ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے ہو جائیگی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی متوقع آمدنی کی کمی کی ایک وجہ تو شرح تبادلہ کا اتار تھا، اور دوسری (اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے) سرکاری ریلوں کی خالص آمدنی میں کمی تھی، متوقع اخراجات کے اسباب وہ مصارف تھے جو شمال مغربی سرحد پر فوجی کارروائیوں اور جدید سرحدی حکمت عملی

---

[1] دیکھو پارہ ۷، حصہ اول رپورٹ زیر بحث۔

[2] دیکھو باب (۵) ماسبق۔

جس کے باعث وسط وزیرستان پر قبضہ کرنے کی وجہ سے برداشت کرنا پڑے۔ اس طرح سے جو حقیقی کمی (۱۱ کروڑ ۰۰ لاکھ روپے) ہوئی، اسے زر کاغذی اور قرضے کے ذریعہ پورا کیا گیا۔ اب یہ بات ظاہر تھی، کہ آئندہ سال کی ۱۸ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی کمی مالیات کے اعلےٰ ترین اصول سے گریز کرنے کے بغیر پوری نہیں کی جا سکتی تھی، چنانچہ رکن مالیات نے جدید محاصل کی تجویز پیش کی جس سے ۱۹ کروڑ روپیہ کی مزید آمدنی کی توقع تھی اس میں سے تقریباً نصف رقم محصول درآمد و برآمد کی نظر ثانی کے ذریعہ، اور باقی نصف ریلوں کے کرایے، محصول آمدنی، محصول بالائی (Super Tax)، اور محصول ڈاک میں اضافہ ہونے کی تحریک سے آنی تھی۔

بعض معمولی ترمیمات کے ساتھ (سب سے زیادہ مخالفت ڈاکخانہ کے محصول کے اضافہ سے متعلق تھی، اور جو تمام جدید محصولوں میں سب سے زیادہ غیر مقبول تھا) اس جدید مالی لائحہ عمل کو ایک واحد مالی مسودہ کی صورت میں دونوں ایوانوں نے منظور کر لیا البتہ جمعیت مقننہ نے بعض رقوم میں کمی اور بعض رقوم کو نامنظور کر کے اپنے اس اقتدار کا ثبوت دیا[1]۔

پہلے موازنہ اور مالی مسودہ کے سلسلہ میں جو بعض دستوری نکات پیدا ہوئے ان کا بیان یقیناً دلچسپ ہوگا۔ مجلس مملکت نے مالی مسودہ میں ترمیم کے حق کو نہایت کامیاب طریقے سے استعمال کیا[2]۔ یہ مسودہ بجز ان مسودوں کے جن کی ابتدا

[1] مثلاً یہ تجویز کہ پچیس ہزار روپے کی ایک رقم جو ایک امریکن مقرر کے اخراجات کے لئے تھی جو ہندوستان آنے والا تھا اسلئے مسترد کر دیگئی کہ ہندوستان کو اس سے کسی قسم کے مادی فائدہ کی امید نہیں۔

[2] مجلس مملکت نے مالی مسودہ کی دو دفعات میں، ترمیم کی۔ اگر جمعیت مقننہ ان ترمیمات کو منظور نہ کرتی تو ایک نہایت ناگوار صورت پیدا ہو جاتی، کیونکہ قاعدہ یہ ہے، کہ اس مسترد ترمیم کو دونو ایوانوں کے متحدہ اجلاس میں دوبارہ پیش ہونے کے لئے کم از کم ۶ مہینے گزر جانے چاہئیں جب بھی مجلس مملکت عمومی ایوان کی مخالفت کے باوجود اپنا حق ترمیم استعمال کرے گی تو یہ صورت حال پیدا ہو جائیگی چنانچہ ۲۲-۱۹۲۱ء کے مسودۂ مال کے سلسلہ میں جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

ایوان زیرین کی طرف سے ہوتی ہے۔ تمام دوسرے مسودوں ہی کی طرح ہوتا ہے۔ مجلس مملکت نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ اسے موازنہ پر مجموعی حیثیت سے بحث کرنے کی اجازت دی جائے لیکن خود اس کے موجودہ قواعد کارروائی کی وجہ سے وہ اس خواہش پر عمل نہ کر سکی یہاں یہ بیان کر دینا چاہیئے کہ جمعیت مقننہ نے دوسرے ایوان کے خلاف بہت رشک وحسد کا اظہار کیا۔ مجلس مملکت نے جو ترمیمات کی تھیں، ان پر اور اس تحریک پر کہ تمام تحریکات دونوں ایوانوں کی متحدہ منتخب کمیٹی کے سامنے پیش ہوں، دونوں ایوانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا، اور جمعیت مقننہ کی یہ تجویز کہ "دونوں ایوانوں کے ارکان بھتے اور اعزازی خطابات کے لحاظ سے مساوی درجہ پر رکھے جائیں"، ایک افسوسناک مباحثہ کے بعد منظور ہو گئی۔[1]

حکومت نے مسودۂ مالیہ سے متعلق ایک اہم آئینی اصول کو بھی منظور کر لیا اور وہ یہ تھا کہ درآمد و برامد کے اخراجات کے علاوہ جن کا غیر متیقن رہنا مناسب نہیں تھا، محصولوں کے متعلق حکومت کو جو اختیارات دیئے جائیں، وہ صرف ۱۲ مہینوں کے لئے حاصل ہوں گے، اس طرح اس اصول کی بنیاد پڑتی ہے کہ تمام مالی مسودات سالانہ پیش کئے جائیں گے۔

ایک اور نئی اصلاح، جس کا مقصد یہ تھا کہ مالیات سے متعلق جمعیت مقننہ اپنے اختیارات کو بہتر طریقے سے استعمال کر سکے، یہ تھی، کہ حکومت نے ایک مستقل ذیلی مجلس مالیہ مقرر کر دی۔ اس مجلس کا صدر، رکن مالیات ہوتا ہے، اور اس کے تمام ارکان کو نیابت متناسبہ کے اصول پر خود جمعیت مقننہ منتخب کرتی ہے۔ اس مجلس کے اجلاس ہر سال میں کئی مرتبہ ہوتے ہیں اور کئی کئی دن تک ہوتے رہتے ہیں۔ محکمۂ مال کی منظوری سے پہلے اور قبل اس کے کہ مختلف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۰) اس صورت حال کے پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا لیکن حکومت نے اپنی سرکاری رایوں کو استعمال کر کے دونوں ایوانوں کے تصادم کو روک دیا۔

[1] آنریبل کا خطاب صرف مجلس مملکت کے ارکان کو حاصل ہے، اور جمعیت مقننہ کے ارکان اپنے ناموں کے بعد صرف ایم۔ ایل۔ اے استعمال کر سکتے ہیں۔

ہدا ست آئندہ موازنہ میں شریک کیے جائیں رکن مال اپنے غیر سرکاری رفقا کو جدید اخراجات کی تجاویز میں (جس میں فوجی اخراجات اور دوسرے ناقابل رائے دہی مدات ہوتے ہیں) اپنا شریک راز بناتا ہے۔ وہ ان رقوم کی تجاویز پر بھی جو تخمینی موازنہ کے بعد ضمیمی مالی اخراجات سے متعلق ہوں ان کے ساتھ مشورہ کرتا ہے۔ اصولاً یہ مجلس محض ایک جماعت شوریٰ ہے۔ مگر تاحد امکان رکن مال ان کی رائے کو قبول کر لیتا ہے، اس مجلس کی حقیقی اہمیت یہ ہے، کہ وہ عوام کے اختیارات کو عملی جامہ پہنانے کا موقع دیتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی ارکان جمعیت مقننہ موازنہ کے ابتدائی مدارج ہی میں اس سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں[1]۔

اب ہم مجالس مقننہ ہند کے دوسرے اجلاس (ستمبر ۱۹۲۱ء) کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں یہ تسلیم کرنا پڑے گا، کہ اس نے اجلاس اول کی توقعات کو مشکل سے پورا کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جمعیت مقننہ نے اس بات کا صاف ثبوت دیا، کہ وہ ملک کی سیاسی بےچینی سے متاثر ہے۔ اس وقت جب کہ انقلابی تحریک جڑ پکڑ رہی تھی بجائے اس کے کہ اس کے ارکان ان کامیابیوں سے فائدہ اٹھاتے جو انھوں نے پہلے اجلاس میں حاصل کئے تھے انھوں نے اپنے کو موجودہ حالات کے عمیق و پر فریب بھنور میں ڈال دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا رائے دہندوں اور قانون سازوں کی سیاسی تعلیم کی ضرورت اب باقی نہیں رہی ہے اور موجودہ اصلاحات کے تمام منافع ان چند مہینوں میں ختم ہو چکے ہیں چنانچہ اب اس رائے کا اظہار کیا جانے لگا کہ نجات اور بچاؤ کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ دستوری ترقی کے متعلق جو مدارج قائم کئے گئے ہیں ملک ان سے نہایت تیزی سے گزر کر منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ اس رائے کی حامیوں میں سے ایک ممتاز شخص نے ایوان مقننہ

---

[1] اس طرح اس کی حیثیت مجلس محاسبات عامہ یعنی کمیٹی آف پبلک اکاؤنٹس سے (جو ایک دستوری مجلس ہے) بالکل جداگانہ ہے۔ اس مجلس کا فرض صرف یہ دیکھنا ہے، کہ رقوم کو واقعی کس طرح خرچ کیا گیا ہے، دیکھو باب ۱۰ جزو ۱ ج

میں کہا کہ "ملک ساحل انقلاب تک پہنچ چکا ہے، اور اگر فوراً کچھ نہ کیا گیا، تو نیشنل کانگرس خلاف ورزی قانون کے اصول کو منظور کرلے گی۔ اور تمام ملک میں نراج کا رواج ہو جائے گا"۔ حقیقت یہ ہے، کہ ان حالات کے اثرات اسقدر پریشان کن تھے، کہ اس اجلاس کا بڑا وقت یوں ہی برباد گیا، اور جمعیت مقننہ کی تمام قوت غیر مفید و ہیجان آفریں مباحث میں صرف ہوگئی۔

منجملہ اس قسم کی متعدد تجاویز کے ذیل کی تحریکوں پر بھی بحث ہوئی :-

(۱) یہ کہ ۱۹۲۴ء کی ابتدا ہی میں صوبوں کی حکومتوں میں کامل آزادی اور حکومت ہند کے فوجی خارجیہ اور سیاسی محکموں کے علاوہ تمام دوسرے محکموں میں ذمہ دارانہ حکومت مروج کی جائے، اور ۱۹۲۹ء کی ابتدا میں نوآبادیات کے قسم کا سوراج منظور کیا جائے (یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وہ سال ہے، جسے قانون حکومت ہند میں پہلے تفتیشی پارلیمنٹی ماموریہ کے تقرر کے لئے مقرر کیا گیا ہے)۔

(۲) یہ کہ ہندوستانیوں کو فوجی، بحری، تعلیمی، خارجی، سیاسی اور امور عامہ کے محکموں میں معتمد، نائب معتمد، شریک معتمد، کی اسامیوں پر مقرر کرنے کی حکمت عملی کا آغاز کیا جائے (یہ تجویز مجلس مملکت میں پیش ہوئی تھی)۔

(۳) یہ کہ فوجی، خارجی اور سیاسی محکموں کے علاوہ، دوسرے محکموں کے لئے بھی جمعیت مقننہ کی منتخب شدہ مستقل ذیلی جماعتیں قائم کی جائیں (یہ تجویز ستمبر کے اجلاس میں پیش ہوئی تھی لیکن بعد میں ملتوی کردی گئی)۔

(۴) یہ کہ بعض اعلیٰ عہدوں (مثلاً گورنر، چیف جسٹس وغیرہ) پر ہندوستانیوں اور یورپیوں کی تعداد کو مساوی بنانے کی کارروائی کی جائے۔

(۵) یہ کہ صنعتی قسم کی چند مخصوص ٹیکنیکل ملازمتوں کے علاوہ تمام ملکی ملازمتوں کی اسامیاں ہندوستان ہی میں پر کی جائیں۔

پہلی تحریک پر دو دن تک مباحثہ ہوتا رہا[۱]، اور ترمیم کے طور پر یہ تجویز پیش کی گئی

[۱] یہ مباحثہ سوراج کے نام سے مشہور ہے (۲۳ و ۲۹ ستمبر ۱۹۲۱ء)۔

کہ یہ تمام معاملہ تحقیقات کے لئے ایک مجلس کے سپرد کر دیا جائے۔ بالآخر رکن امور داخلیہ کی تحریک پر ایک مدعا لیہ ترمیم تسلیم کرلی گئی اور ایوان نے منظور کیا، "کہ ہندوستان نے حکومت خود اختیاری کی راہ میں جو ترقی کی ہے، وہ اس بات کی مقتضی ہے، کہ موجودہ آئین پر ۱۹۲۹ء سے پہلے نظر ثانی کی جائے"۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے، کہ حکومت نے اپنے رویہ سے اس بات کا یقین دلا دیا کہ وہ تجویز کی موجودہ شکل کی حامی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے خود اس کے روش کے متعلق بہت کچھ غلط فہمی پیدا ہونے لگی تھی کہ اصلی تجویز کے محرک نے اپنی جوابی تقریر میں تو حکومت کو اس بات پر مبارکباد بھی دیدی، کہ اس نے اس بات کو صحیح و باموقع سمجھا، کہ "وہ پارلیمنٹ سے قریب ہی کے زمانے میں ایک مامور یہ روانہ کرنے کی سفارش کرے"۔

چونکہ پانچویں تجویز پر (جو اہمیت کے لحاظ سے پہلی کے بعد ہے) بحث اس اجلاس ستمبر کے بالکل آخری وقت میں شروع ہوئی۔ اس لئے اس پر دوسرے اجلاس میں (یعنی ۱۱ فروری ۱۹۲۲ء کو بہت کچھ بحث ہوئی۔ محرک نے اپنی تجویز نہایت ہی اعتدال آمیز الفاظ میں پیش کی کہ وہ ملازمتوں کے ہندیانے کی تجویز کو جتنی قومی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں، ویسے ہی معاشی حیثیت سے بھی اس تجویز کے مباحثہ میں بھی رکن داخلیہ نے ایک ترمیم کے ذریعہ تجویز کو منظور کرانے کی کوشش کی، اور وہ ترمیم یہ تھی۔ کہ "بہت جلد اس قسم کی تحقیقات شروع کی جائے، جس سے اگست ۱۹۱۷ء کی تجویز کو کہ تمام ملکی ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھائی جائے[1]، مزید عملی جامہ پہنایا جاسکے اور اس بات کا انتظام کیا جائے کہ ہندوستان میں اس قسم کی تعلیم دی جائے جس سے ہندوستانی ٹکنیکل ملازمتوں میں زیادہ تعداد میں داخل ہوسکیں"۔

میں نے جو تین اور تجاویز درج کی ہیں، اگرچہ کم اہم ہیں لیکن ان سے بھی یہ پتہ

[1] اگست ۱۹۱۷ء کی جس تجویز کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے، اس پر جس حد تک عمل کیا جاچکا ہے، اس کا حال باب (۵) کی ابتدا میں دیا جاچکا ہے۔

چلتا ہے، کہ ان میں بھی جدید آئین کی ترمیم کی ضرورت کا اظہار کیا گیا اور ساتھ ہی اس خواہش کو بھی پیش کیا گیا کہ حکومت کے ذمہ دار عہدوں پہ برطانوی اشخاص کی جگہ ہندوستانی مقرر کئے جائیں تیسری تحریک کی جسے جنوری ۱۹۲۲ء کے ابتدائی جلسوں ہی میں زیر بحث لایا گیا تھا، حکومت نے مخالفت کی، اور اس کی وجہ یہ بتائی، کہ اس طرح کام کرنے ہیں، محکمۂ حکومت کے افسروں کو جو پہلے ہی سے کثرت کار کی وجہ سے پریشان ہیں، اور زیادہ کاموں کا بار پڑ جائیگا، اور غیر سرکاری ارکان کے وقت کا مطالبہ اس کے علاوہ ہے۔ اس بحث میں اس تنقید کا حوالہ دیا گیا، جو لارڈ برائس نے ممالک متحدہ امریکہ کی مجالس ایوانات (ہاؤس کمیٹیز) کے متعلق کی تھی، رکن داخلہ نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی، کہ ایک ایسی کمیٹی بنائی جائے، جو تحریکات قانونی کی جانچ کر سکے۔ یہ تحریک ۳۰ کے مقابلہ ۴۹ کی کثرت سے منظور ہو گئی[1] دوسری تحریک میں بھی جو مجلس مملکت میں پیش ہوئی تھی، حکومت کی تحریک پر ترمیم کر دی گئی، اور وہ بلا اختلاف رائے منظور کر لی گئی چوتھی تحریک کثرت رائے سے مسترد کر دی گئی۔

اس اجلاس میں جمعیت مقننہ نے ضمنی منظوریوں کے مطالبہ کے سلسلے میں ذمہ دارانہ تنقید کر کے اپنی امر شناسی کا ثبوت دیا ضمنی تخمینی اخراجات کو پیش کرتے ہوئے رکن مال نے کہا کہ "ہر رقم کو مجلس عالیہ نے منظور کر لیا ہے" لیکن ایوان نے ۴۷ رایوں کے مقابلہ میں ۴۶ رایوں سے دو لاکھ روپے کی رقم نامنظور کر دی، جو اس کام کے لئے تھی کہ لٹن کمیشن، ہندوستانی طلبہ مقیم انگلستان سے متعلق مقرر ہوا تھا، وہ جب ہندوستان میں تحقیقات کے لئے آئے، تو اس کے اخراجات میں صرف کیجائے۔ اس قابل لحاظ استثنا کے علاوہ تمام مطالبات مکمل طور سے

[1] اس اجلاس کے آخر ایام میں اس مضمون کی ایک تحریک پیش کی گئی تھی کہ حکومت کے ارکان کو جو مختلف محکموں کے ذمہ دار ہیں، امداد دینے کے لئے پارلیمنٹی ماتحت معتمد مقرر کئے جائیں، لیکن وہ مسترد کر دی گئی۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ یہ خوف پیدا ہو گیا تھا، کہ ان اسامیوں کو پر کرنے کے لئے جن لوگوں کو منتخب کیا جائے گا، وہ سرکاری آدمی ہو جائیں گے، اور اس طرح اپنی آزادی کھو بیٹھیں گے۔

منظور کر لئے گئے۔

اب ہم جنوری تا مارچ ۱۹۲۲ء کے اجلاس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یہ اجلاس اہم واقعات سے پر اور مختلف حیثیتوں سے بہت نازک اجلاس تھا اور اجلاس ستمبر کے مقابلہ میں قانون سازی کے اعتبار سے بہت مفید تھا بین الاقوامی معاہدوں کی تکمیل کی غرض سے جس پر ہندوستان کے بھی دستخط تھے، ایک قانون عورتوں اور بچوں کی بد کارانہ تجارت کے انسداد کے لئے منظور کیا گیا، اور قانون کارخانجات میں بہت سی ترمیمیں کی گئیں۔ کتاب قوانین میں جن دوسری اہم باتوں کا اضافہ ہوا ان میں قانون ترک وطن، قانون آمدنی کی ترمیم اور قانون متعلقہ قیام جا دہلی قابل ذکر ہیں۔ ایک غیر سرکاری اہم تجویز بدقسمتی سے منظور نہ ہو سکی، یہ ڈاکٹر گوڑ کا مسودہ متعلق قانون مناکحت غیر مذہبی تھا جو مختلف مذاہب اور فرقوں کے اشخاص کی شادیوں میں مزید سہولت بہم پہنچانے سے متعلق تھا لیکن کثیر عقائد والوں کی مخالفت اس کے لئے مانع ثابت ہوئی اور مسودہ نامنظور رہا۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ حکومت نے اپنی سخت ترین مذہبی غیر جانبداری کو قائم رکھا۔

اس اجلاس کی دوسری خصوصیت وہ تائید تھی، جو حکومت کو تحریک عدم تعاون کے دبانے کے ذرائع سے متعلق دونوں ایوانوں سے حاصل ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی حکومت نے جس تحمل سے کام لیا تھا اس سے حکومت کو اس بات کی توقع تھی، کہ غیر سرکاری ارکان رائے دینے میں اپنی تائید کو اسقدر مشروط نہ بنائینگے۔ مجلس مملکت کی ایک تحریک کہ دونوں ایوانوں کا ایک مشترکہ اجلاس اس غرض سے منعقد کیا جائے کہ جماعت تارکین موالات سے صلح کی جائے، ۱۰ رایوں کے مقابلہ میں ۲۲ رایوں سے نامنظور ہوئی۔ اسی طرح ایک گول میز کانفرنس سے متعلق ترمیم بھی نامنظور ہوئی۔ ٹھیک اسی دن (۱۸ جنوری ۱۹۲۲ء) جمعیت مقننہ میں "تشدد کی حکمت عملی کو فوراً ترک کر دینے پر" مباحثہ ہوا، اس تحریک کی مخالفت میں بعض قابل لحاظ تقریریں کی گئیں اور ان تقریروں کا زور اس وقت اور بڑھ گیا، جب رکن داخلہ نے حکومت کے گزشتہ سال کے طریقۂ عمل پر اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "ہمارے سامنے کبھی بھی کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جو ہمارے

سامنے آیا ہو اور ہم نے ایمان دارانہ طریقہ سے اس میں جمعیت مقننہ کے اعتدال پسند ارکان سے متحد الرائے ہونے کی کوشش نہ کی ہو تاکہ ہم اعتدال پسند فریق کو ملکی بہبودی کے لئے ایک عملی قوت نہ بنا دیں"۔ بہر حال تجویز ۴۳ رایوں کے مقابلہ میں ۵۴ رایوں سے مسترد ہو گئی۔ اقلیت کی تعداد پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ دو صوبوں (بنگال اور بہار اڑیسہ) میں اس قسم کی حکومت پر عدم اعتمادی کی تجاویز بہت زیادہ کثرت رائے سے منظور ہو چکی تھیں۔ اس اجلاس کے آخری زمانے میں حکومت نے قانون وامن کی حفاظت کے لئے جو کارروائی کی تھی اسے جمعیت مقننہ نے متعدد مرتبہ صحیح تسلیم کیا[۱]۔

تاہم نہایت اہم اور تحیر آفریں واقعات موازنہ کی بحث کے وقت پیش آئے۔ جنوری میں ایوانہائے مقننہ کے اجلاس کے شروع ہونے کے ساتھ ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ گزشتہ مارچ میں جو محاصل منظور کئے گئے تھے ان کے باوجود حکومت کو بہت زیادہ کمی سے سامنا کرنا ہے اور ساتھ ہی اخراجات کی معتدبہ کمی کی کوئی امید بھی نہیں۔ اس کے ساتھ اس واقعہ نے کہ تمام صوبہ واری حکومتیں بھی اس مالی کمی کا شکار ہو رہی تھیں، صورت حال کو نازک تر بنا دیا۔ حکومت نے اس سلسلہ میں یہ کارروائی کی کہ ایک خاص افسر مقرر کیا اور اسے ہر محکمہ میں ہر قسم کی تخفیف کا اختیار دے دیا؛ نیز اس افسر کے ساتھ دونوں ایوانوں کے دو دو غیر سرکاری ارکان بھی شامل کر دیئے لیکن جمعیت مقننہ کو اس سے تسکین نہ ہوئی اس لئے کہ اس کی خواہش یہ تھی کہ ایک ایسی ذیلی جماعت مقرر کی جائے جو انگلستان کی گیڈس کمیٹی Geddes Axe کی طرح ایک آزاد "تبر تخفیف" کا یہاں ہندوستان میں بھی عمل کرے۔ اس مفہوم کی ایک تحریک تمام غیر سرکاری ارکان کی رائے سے جن میں یورپی عنصر بھی شریک تھا منظور ہو گئی۔ اسی قسم کی ایک اور تجویز بھی منظور ہوئی اور اس کی بھی حکومت نے مخالفت کی۔

---

[۱] ایک اہم قانون پر جس کے ذریعہ پولیس میں بد دلی پیدا کرنے والوں کے لئے سزا مقرر کی گئی تھی منتخب شدہ کمیٹی کے ارکان میں جس کے حوالہ یہ مسودہ کیا گیا تھا، اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور حکومت اس قانون سے متعلق کوئی کارروائی نہ کر سکی۔

جس کے مطابق کم از کم اس سال کے لئے فوجی اخراجات (اور دوسرے ناقابل رائے دہی اخراجات) کو بھی جمعیت مقننہ کی رائے کے ماتحت کر دیا جائے۔ اس مسئلہ پر حکومت انگلستان کے قانونی مشیروں سے استصواب کیا گیا، انھوں نے بتایا کہ اگرچہ قانون ہند ۱۹۱۹ء کی دفعہ ۲۵ (۳) میں اس بات کا موقع حاصل ہے کہ (گورنر جنرل کی رضامندی پر) ان تخمینوں پر جماعت مقننہ میں بحث کی جائے، لیکن سوائے پارلیمنٹ کے کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں، کہ وہ اس قسم کے اخراجات کو جو جمعیت مقننہ کے قبضۂ اختیار سے باہر ہیں، اس قسم کے اخراجات میں جو جمعیت مقننہ کے زیر اختیار ہیں تبدیل کر دے[1]۔ رکن مال نے موازنہ پیش کرتے ہوئے اس فیصلہ کا اعلان تو کر دیا، لیکن اس سے اس کے کام میں مشکلات ہی کا اضافہ ہو گیا۔

یکم مارچ کو جو سالانہ مالی بیان پیش کیا گیا اس نے صورت حال کو مفصلہ ذیل طرز پر ظاہر کیا۔ سال ابھی ختم ہوا اس میں شرح تبادلہ کے خطرناک نقصانات سرکاری ریلوں کے عملی اخراجات میں زیادتی، اور سرحد پر فوجی کارروائیوں کے وجوہ سے ۱۱ کروڑ ۴۰ لاکھ روپیہ آمدنی سے زیادہ خرچ ہوئے، تجارت کی سرد بازاری سے جو سیاسی بےچینی سے بہت کچھ متاثر ہوئی ۱۲ کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا، ان اسباب کی وجہ سے جملہ کمی ۳۴ کروڑ کی ہوئی جو قرضے اور انتفاع زر کی وجہ سے پوری کی گئی۔ اور گزشتہ چار برسوں کی کمی ملکر یہ تعداد ۹۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ آئندہ سال کے لئے ایک ارب ۳۴ کروڑ روپے کے تخمینی اخراجات کا سامان کرنا تھا اس کے مقابلہ میں ۱۹۲۱ء کا نظر ثانی کردہ تخمینہ ایک ارب ۳۴ کروڑ روپیہ کا تھا (جس میں فوجی اخراجات ۶۲ کروڑ روپے ہی رہے) موجودہ محاصل کی صورت میں اس سال کی آمدنی کا اندازہ ایک ارب ۔ اکروڑ روپیہ کیا گیا تھا (درانحالیکہ آمدنی کا تخمینہ ایک ارب ۱۹ کروڑ ۵۰ لاکھ تھا)۔ رکن مال اپنی تقریر میزانیہ کے خاتمہ پر یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ عہد ماضی میں ہندوستان کا مالی اعتبار دنیا میں بہت بلند رہا ہے، اگر اسے

---

[1] دونوں قسم کے اخراجات کے فرق کے لئے دیکھو ص ۱۱۷ ماسبق۔

اپنی یہ بلند اعتباری قائم رکھنا ہے، اور اگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنے سیاسی اعتبار کو بھی جو اتنا ہی اہم ہے، باقی رکھنا چاہتا ہے، تو اسے وہ علاج کرنے میں جو اس کے لئے ضروری ہے ذرا بھی پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے۔"

اس کمی کو پورا کرنے کے لئے رکن مال نے جدید محصولوں کا ایک لائحہ عمل پیش کیا اس سے تقریباً ۲ ارب ۹۰ لاکھ روپیہ کی آمدنی اور پھر ۳ کروڑ کی کمی رہ جاتی تھی۔ اس کی تجویز تھی، کہ ریل کے کرایہ میں ۲۵ فی صدی کا اضافہ کر کے ۶ کروڑ اور محصول نمک کو (جو اس وقت دو پیسے فی روپیہ تھا) دُگنا کر کے ۵ کروڑ حاصل کر لئے جائیں، باقی رقم اس طرح حاصل کی جائے کہ ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑوں پر قیمت کے مطابق ۳½ فی صدی کے بجائے ۷½ فی صدی محصول لیا جائے۔ اور درآمد برآمد کے محصول کو حسب قیمت ۱۱ سے ۱۵ فی صدی تک بڑھا دیا جائے۔ (مثلاً شکر میں ۲۵ فی صدی اور سامان عیش و آرام میں ۳۰ فی صدی اضافہ ہو) اس کے ساتھ ہی ڈاکخانہ کے محصولوں کو بڑھا دیا جائے، اور بڑی بڑی آمدنیوں پر مزید محصول لگایا جائے۔

رکن مال نے اعلان کیا، کہ حکومت ایوان مقننہ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ایک آزاد تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرے گی! اس کے بعد آخر میں اس نے یہ بھی کہا، کہ اس کو امید ہے کہ اس کمیٹی کو فوجی و ملکی دونوں کے اخراجات پر غور کرنے کا حق ہو گا۔ اس کے علاوہ اس نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ حکومت اس کوشش میں مصروف ہے، کہ وہ شمالی مغربی سرحد کے مشکلات کے متعلق ایک مستقل حکمت عملی اختیار کرے خاتمہ پر اس نے یہ بھی بیان کیا، کہ چونکہ قبل از جنگ تعداد فوج میں ۲۹۰۰۰ آدمیوں کی کمی کی جا چکی ہے[۱] اور اس وقت چونکہ خود ہندوستان اور سرحد میں عام بے چینی پھیل رہی ہے، اس لئے حکومت فوج کے تخمینہ میں کسی کمی پر غور نہیں کر سکتی۔

[۱] لیکن سپہ سالار افواج کے قول کے مطابق یہ کمی اس شرط پر لگائی گئی تھی، کہ موجودہ فوج کو بہترین تمام اسلحہ سے مسلح کیا جائے لیکن یہ شرط اب تک پوری نہیں ہوئی ہے، اور اس کی تکمیل میں بھی بارہ مہینے اور لگیں گے۔"

ان تسلی بخش باتوں نے بھی جمعیت مقننہ کے اس فریق کو جو ہر حال میں تخفیف کی حامی تھی، مطمئن نہیں کیا، اور اس نے احتجاج کے طریقے پر خاص طور پر جو فوجی تخمینہ سے متعلق تھا، ملکی اخراجات کی اکثر مدوں پر ۵ فی صدی کمی کا مطالبہ کر دیا، اور جہاں اس نے ۱۱ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ کے جدید محصولوں کی منظوری دی، وہیں اس نے مندرجہ ذیل عنوانوں کے ماتحت ۱۰ کروڑ کی جدید آمدنی کو مسترد کر دیا۔ وہ مدات یہ ہیں، محصول نمک اور روئی کے بنے ہوئے کپڑوں پر محصول درآمد کا اضافہ (کہ اس سے غربا کو سخت تکلیف ہوگی) روئی اور مشنری کلوں کی درآمد کے محصول کا اضافہ (کہ اس سے ملکی صنعت کو صدمہ پہنچے گا۔) اس طرح رکن مال کے یہاں ۱۱ کروڑ ۳۰ لاکھ کی، یا اگر ہم ان کمیوں کو بھی لے لیں جو ملکی محکموں میں کی گئی تھیں، تو ۱۱ کروڑ ۴۰ لاکھ کی کمی رہ گئی۔ آخر میں ایک ایسی تجویز پیش کی گئی، جسے حکومت نے بھی قبول کر لیا، اور جس کے ذریعہ آمدنی کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی، اس آمدنی کی رقم ۳ کروڑ تھی، اور اب کمی ۹ کرور کی رہ گئی۔ آخر میں حکومت نے محصول نمک کے دوگنے کرنے سے متعلق جس دفعہ کو مجلس مملکت نے دوبارہ بحال کر دیا تھا، اس کے منظور کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح جمعیت مقننہ کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اس نے اس بات کا عملاً اقرار کیا کہ ایوان بالا کو ایوان عام کی ظاہر کردہ مرضی کے خلاف مالی مسودہ میں ترمیم کا حق نہیں ہے۔

مصالحت کے ذریعہ[1] ایک دستوری خطرہ کو جس میں گورنر جنرل کو اپنے خاص حقوق[2] استعمال کرنے پڑتے ٹال دیا گیا۔ جمعیت مقننہ کے اس رویہ سے جو اس نے حکومت کے بیان کے خلاف اختیار کر رکھا تھا، ہندوستان کی مالی ساکھ کو جو صدمہ پہنچا، اس کا اندازہ صرف آئندہ سال کی مالی حالت بتا سکتی ہے۔

---

[1] کیونکہ اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ ایوان مقننہ نے آئندہ دوسرے سال کے لیئے ۱۱ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کے جدید محاصل کی منظوری دی تھی۔

[2] ان اختیارات کے حالات کے لیئے دیکھو صفحات ۱۰۲-۳ ماسبق۔

اجلاس کے خاتمہ سے قبل ایوان مقننہ نے ایک ارب ۵۰ کرور کے اخراجات کی منظوری دی اور یہ طے کیا کہ یہ رقم قرضہ سے حاصل کی جائے، اور اسے ہندوستانی ریلوں کی ترقی کے لئے پانچ سال میں خرچ کیا جائے جس کی ضرورت کی طرف ایکورتھ ریلوے کمیٹی نے اپنی گزشتہ سال کی رپورٹ میں توجہ منعطف کرائی تھی۔

یہاں پر ہم ان دو محضروں کا بھی ذکر کر دینا چاہتے ہیں جن کو جماعت مقننہ ہند اور حکومت ہند نے حال ہی میں پیش کیا ہے[1] کیونکہ ان کا اثر بیرونی ہند کے ہندوستانیوں کے قومی مفاد و جذبات پر پڑتا ہے، اور ان سے اہم ترین آئینی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان کا خارجی مرتبہ نہ صرف غیر متیقن ہے، بلکہ ایک بڑی حد تک خود اپنی ضد ہے؛ ایک طرف تو اسے حکومت برطانیہ کی مجلس میں "شریک و مساوی" کی حیثیت سے داخل کر لیا گیا ہے، اور دوسری طرف برطانوی وزیر خارجہ نے نہایت ہی صحیح طریقہ سے اس کے مرتبہ کو "حکومت ماتحت" کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔ ہندوستان کا حقیقی درجہ جو بھی ہو، اب جب کہ ہندوستانی عنصر بڑھ گیا ہے، اور حکومت ایوانہائے مقننہ کی بڑی حد تک محتاج ہو گئی ہے، تو ہندوستانیوں کے قومی جذبات کی ترجمانی کے ناقابل اعتراض طریقہ کو اپنا مسلک بنا لیا ہے۔

ان میں سے اولین محضر، برطانوی مشرقی افریقہ کے ہندوستانیوں کے مرتبہ سے متعلق تھا جسے جمعیت مقننہ نے حکومت ہند کی تائید کے ساتھ مندرجہ ذیل تجویز منظور کر کے اسے بذریعہ تار وزیر ہند کے پاس بھیجا تھا، کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل ملک معظم کی حکومت (یعنی برطانوی کابینہ) کے سامنے یہ پیش کرنا چاہتا ہے کہ اگر ملک معظم کے کسی افریقی مقبوضہ میں ہندوستانیوں کے ملک معظم کی دوسری رعایا کی طرح مساویانہ حقوق کے قانونی مطالبہ کو تسلیم نہ کیا گیا تو یہ ہندوستانیوں کے حقوق شہریت کی بہت بڑی تخریب سمجھی جائے گی، کیونکہ اس حق کو حال ہی میں ۱۹۲۱ء کی شہنشاہی کانفرنس میں تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی

---

[1] فروری، مارچ ۱۹۲۲ء۔

تصدیق کی گئی ہے[1]،

دوسرا محضر اس اعلان کی شکل میں تھا، جسے حکومت ہند نے صوبہ داری حکومت کی (مع ان کے وزرار کے) منظوری کے ساتھ شائع کیا تھا، اور اس میں نہایت صاف طریقے سے اس بات پر زور دیا تھا، کہ ترکوں کے ساتھ جو صلحنامہ ہوا تھا اس پر نظر ثانی کے وقت ہندوستانی مسلمانوں کی رائے کا لحاظ رکھا جائے اس اعلان کے شائع کرنے کا نتیجہ یہ ہوا تھا، کہ مسٹر مانٹیگو کو جو وزیر ہند تھے، فوراً استعفا دینا پڑا کیوں کہ انھوں نے برطانوی کابینہ سے استصواب رائے کئے بغیر اس کی اشاعت کی اجازت دیدی تھی۔

اب جبکہ ہم صوبہ داری حکومتوں اور مجالس مقننہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو فطرۃً یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے، کہ عملاً یہ دوعملی حکومت کیسی ثابت ہوئی۔ اس مسئلہ پر غایت احتیاط سے زائد از زائد یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس دوعملی نے جس کا تخیّل اس کے بانیوں کے دلوں میں تھا، ابھی تک عملی جامہ پہنا ہی نہیں ہے، اس ابتدائی مرحلہ میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ صوبوں کے اصلاح شدہ انتظام حکومت میں یہ دوعملی صرف ایک دھندلا سا البید لائحہ عمل ہے اور بس بہت سی ایسی چیزیں موجود تھیں جو اس دوعملی کے پس پشت رہنے میں

---

[1] اگر ہم آئینی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ برطانوی مشرقی آفریقہ کے مقبوضات میں جو براہ راست برطانوی محکمۂ نوآبادیات سے متعلق ہے، ہندوستانیوں کو جو سیاسی و اقتصادی دشواریاں ہیں، وہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے حالات سے بالکل مختلف ہیں سنہ ۱۹۲۱ء کی شہنشاہی کانفرنس میں جنوبی افریقہ کے علاوہ تمام نوآبادیوں کی حکومتوں نے داخلہ تارکان وطن کو محدود کرنے کے حق کو محفوظ رکھتے ہوئے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ ان ہندوستانیوں کو، جو قانوناً ان نوآبادیات میں آباد ہیں، مساویانہ شہری حقوق دیں گی۔ جنوبی افریقہ سے متعلق جمعیت مقننہ نے حکومت ہند کی تائید کے ساتھ گزشتہ ستمبر میں یہ منظور کیا ہے، کہ "جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے لئے مساویانہ حقوق حاصل کرنے کی جلد از جلد کوشش کی جائے"۔ اس مسئلہ میں جنوبی افریقہ کی حکومت سے خط وکتابت ہو رہی ہے۔

معاون ہوئیں، کم از کم ایک صوبہ کے گورنر نے تو صاف صاف اس بات کو ظاہر کر دیا، کہ وہ وحدت حکومت کے طرز کو فوقیت دیتا ہے[1]، یہ سال انتہائی سیاسی بے چینی کا تھا، اور ایسے حکام نے جو قیام امن و امان کے ذمہ دار تھے، ایک سے زائد صوبوں میں نازک ترین مواقع پر وزرا کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی تو کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں۔ صوبجات متحدہ میں ایک وزیر نے مقامی مجلس مقننہ کے اس مباحثہ میں جو اس کارروائی سے متعلق تھا جس کے ذریعہ کاشتکاروں کے بعض بلووں کو روکا گیا تھا، عملاً مداخلت کرکے اس بات کی کوشش کی کہ اس تجویز کو جو ایک محفوظ محکمہ کے طریقۂ عمل کے متعلق ہے واپس لے لیا جائے۔ خیال کیا جاتا ہے، کہ اس قسم کی حکمت عملی سے عموماً دو قسم کے افسوسناک نتائج پیدا ہوتے ہیں[2]، اولاً اس سے وزرا پر خود احساس آزادی کے صحیح ارتقاء کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور نہ وہ اس اجتماعی ذمہ داری کو جو محکمہ جات مفوضہ کے انتظام کے متعلق ان پر عائد ہوتی ہے محسوس کرتے ہیں، دوسرے یہ خود وزرا کی حیثیت کو ایک غلط انداز سے ظاہر کرتی ہے۔ اگر یہ عام خیال پیدا ہوگیا، کہ وزرا نے اپنے کو ناقابل برخاست عاملانہ جماعت سے ملا لیا ہے تو ان کے لئے یہ ناممکن ہو جائیگا، کہ وہ مجلس مقننہ سے قریبی تعلقات پیدا کر سکیں، اور مجلس مقننہ کے ان قائم مقاموں، یعنی "ذمہ دار" وزرا کو "سرکاری آدمی" سمجھا جانے لگے گا، اور وہ اپنے سرکاری رفقا کی طرح عام مخالفت کا نشانہ بن جائیں گے[3]۔

---

[1] سر ہارٹ کورٹ بٹلر نے صوبجات متحدہ کی مجلس مقننہ کی افتتاح کرتے ہوئے کہا "میری حکومت کا معاملہ تو میں نے ایسے لوگوں کو اپنا رفیق منتخب کیا ہے، جو سیاسی اعتبار سے قوی اور آزاد ہیں، مجھے مرحلہ میں ان پر کامل اعتماد ہوگا۔ اور میری خواہش ہے، کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے ہم متحد ہو کر ایک واحد حکومت بنا لیں۔

[2] لارڈ ولنگڈن نے، قانون اور پولیس کے محکموں کو مجلس عاملہ کے ایک ہندوستانی رکن کے قبضے میں دے کر جو دلچسپ تجربہ شروع کیا ہے، وہ ایک دوسرے دستوری اصول پر مبنی ہے۔

[3] سر ولنٹائن چرول نے اپنی حال کی تصنیف "ہندوستان قدیم و جدید" (انڈیا اولڈ اینڈ نیو)

واقعہ یہ ہے کہ صوبہ کی مجلس مقننہ کے کسی رکن کے لئے یہ کام آسان نہیں ہے کہ حکومت کے نصف عمومی اور نصف سرکاری کے درمیان مجلس مقننہ سے تعلقات اور بنائے تعلقات، واختلافات کے اصول کو سمجھ سکے۔ ایک سے زائد صوبہ کے گورنروں نے یہ امر صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ممالک متوسطہ کے گورنر نے اپنی کونسل کا افتتاح کرتے وقت کہا کہ "مفوضہ محکموں کا انتظام آپ کے ذمہ کیا جاتا ہے، محفوظ محکموں میں بھی آپ کو بہت کچھ اختیارات حاصل ہیں، اور حکومت کی خواہش ہے، کہ محفوظ محکموں کا انتظام بھی مجلس مقننہ کی معقول رائے کے مطابق کیا جائے" گورنر بنگال نے مجلس مقننہ کے اولین اجلاس کی اختتامی تقریر میں اس اصولی اختلاف پر جو تمام شعبوں میں عموماً اور مالیات میں خصوصاً مجلس مقننہ کو محفوظ ومنتقل محکموں کے سلسلہ میں جو حقوق حاصل ہیں، اون کے متعلق اظہار خیال کیا۔

بہرحال اس بات کی کسی کو توقع نہیں ہوسکتی تھی، کہ وزراء ایک سال کے اندر ہی ایسے لائحۂ عمل پیش کرنے میں کامیاب ہوں گے[ل] جو عوام الناس کے دل کو لگنے اور جو عام توجہ کو ان محکمہ جات مفوضہ کی (تعلیم، صحت عامہ، مقامی حکومت خود اختیاری) کی طرف متوجہ ومنعطف کرسکیں عملاً بھی حالات بہت کچھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۷۳)) میں اس مسئلہ سے متعلق مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے (ص ۲۳۸) "صوبوں کے گورنروں نے اپنی حکومتوں کے دونوں بازوؤں کو، حکومت کے مشترک کاموں میں مساویانہ طریقے سے شریک کرنے کی جس عاقلانہ حکمت عملی کو اختیار کیا ہے، اس نے محفوظ ومفوض محکموں کے امتیاز کو بالکل ختم کردیا ہے سانا کہ اگرچہ حقیقتہً ایسا نہیں ہوا ہے، لیکن پھر بھی اس سے اس حاسدانہ ناگوار صورت کا جو لفظ "دوعملی" سے پیدا ہوتی تھی، خاتمہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ ایک صوبہ کے گورنر نے مجھ سے کہا: کہ "ہم منزل دوعملی پر سے جست کر رہے ہیں" میرے نزدیک اصلی واقعہ یہ ہے کہ اب تک حکومت حقیقی دوعملی کے درجہ تک جس میں ایک حقیقی ذمہ دارانہ حکومت شامل ہے نہیں پہونچی"۔

ل اس حیثیت سے مدراس کو مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہاں غیر برہمن وزراء اور مجلس مقننہ کی کثرت رائے میں جو اتحاد خیال ومقصد تھا اس وجہ سے دونوں ایک دوسرے کی تائید پر مجبور ہوگئے اور یہی تائید تھی جو دوسری جگہ مفقود نظر آتی ہے۔

مخالف تھے۔ یہ صحیح ہے کہ بیان کردہ اصول کے مطابق بعض صوبوں نے تعلیم حکومت خود اختیاری کے سلسلہ میں قابل تعریف ترقیاں کی ہیں، لیکن اس سے زیادہ حوصلہ مندانہ تجاویز عام مالی مشکلات کی وجہ سے عالم وجود میں نہ آسکیں۔ اس کے علاوہ ہر شخص کے خیالات تحریک ترک موالات یا عدم تعاون کے مدوجزر کی طرف مرکوز تھے، وزراء ان کی حکمت عملی اور ان کے محکمے عدم توجہ کا شکار ہوتے رہے اور ان کو ایک بڑی حد تک پس پشت ڈالدیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ایک ایسا محکمہ جو وزراء کے ماتحت تھا، اور جس کے خلاف سخت طوفان مخالفت برپا تھا آبکاری کا محکمہ تھا۔ ناقابل عبور عملی مشکلات کا خیال کئے بغیر اور منشیات کی ممانعت سے صوبہ کے مالیات پر جو بڑا اثر پڑتا، اس پر غور کئے بغیر، ایک سے زائد صوبوں میں اس بات کا سخت مطالبہ تھا، کہ منشیات کی بالکل ممانعت کردی جائے چنانچہ اپنی غیر ہر دلعزیزی میں آبکاری کا محکمہ بھی پولس سے کسی طرح کم نہیں رہا۔ اگرچہ بعض غیر معمولی صورتوں میں وزرا کو مجلس مقننہ میں شکستیں ہوئیں لیکن اس سال کوئی وزیر بھی مستعفی نہیں ہوا، البتہ ایک وزیر (آنریبل مسٹر مادھوسودن داس وزیر بہار و اڑیسہ) نے مجلس مقننہ کو صاف صاف اس بات سے آگاہ کردیا تھا کہ اگر اس نے اس کی تائید نہ کی تو وہ عہدہ سے الگ ہو جائیں گے۔

اب اگر ہم یہ سوال کریں کہ ان مجالس مقننہ نے اپنے فرائض کس طرح انجام دیئے تو اس کا جواب مختلف جماعتوں کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوگا۔ یہاں یہ بھی ہم کو یاد رکھنا چاہئے۔ کہ تحریک عدم تعاون کے اثر سے ان مجالس کی نیابتی حیثیت مکمل نہ تھی۔ قانون پیشہ سیاست دان اپنی مناظرانہ ذہنیت اور مسلمہ عقائد پرستانہ و استیصالانہ خیالات کے ساتھ کثرت سے صوبوں کی مجالس مقننہ میں موجود تھے۔ لیکن بعض مجالس میں زمیندار طبقہ کی آراء کو غلبہ حاصل تھا۔ اول الذکر صورت حال بنگال و بہار و اڑیسہ میں تھی، اور موخر الذکر صوبجات متحدہ اور پنجاب میں۔ اس بات کا پتہ اس رویہ سے چلتا ہے، جو مجالس مقننہ نے حکومت کے خلاف عدم تعاون کے متعلق اختیار کر رکھا تھا۔ مجلس مقننہ بنگال، حکومت کی حکمت عملی کو اس قدر سخت نقادانہ نظر سے دیکھتی تھی کہ کم از کم تین مرتبہ

ایک تجویز جو تجویز ملامت کے ہم معنے تھی، کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔ اس کے ہمسایہ صوبہ بہار و اڑیسہ کی مجلس مقننہ میں بھی اس قسم کی تجویز کثرت رائے سے منظور ہو گئی؛ لیکن دوسری طرف پنجاب میں اس قسم کی تجویز کم از کم دو مرتبہ پیش ہوئی، اور دونوں مرتبہ حکومت کے حق میں فیصلہ ہوا، صوبجات متحدہ میں بھی تین چار مرتبہ یہی صورت حال پیش آئی۔

جیسا ہم دیکھ چکے ہیں، مدراس کی مجلس مقننہ میں غیر برہمنوں کی مستحکم اکثریت تھی، اور اس چیز نے بدقسمتی سے متعدد مباحث کو نہ صرف تعصب کا شکار بنا دیا بلکہ مجلس مقننہ کے زاویۂ نگاہ کو بھی تنگ تر کر دیا کیونکہ ہر مسئلہ پر وسیع طریقہ سے غور کرنے کے بجائے برہمن و غیر برہمن نقطۂ نگاہ سے بحث ہوتی۔ اسی طرح صوبجات متحدہ کی مجلس مقننہ کی زمیندار جماعت بعض عام سوالات کو بہت تنگ نظری سے دیکھتی تھی؛ یہ تنگ نظری مسودۂ ترمیم قانون لگان اودھ کی بحث میں بہت نمایاں تھی، کیونکہ ٹھیک اس وقت جبکہ ایک دیرینہ زراعتی مسئلہ کا تشفی بخش حل ممکن تھا زمینداروں نے اسے شکست دیدی؛ اس کی وجہ یہ نہ تھی، کہ زمیندار جماعت مراعات دینے پر تیار نہ تھی، بلکہ وہ اسقدر زیادہ مراعات نہیں دینا چاہتی تھی جتنی اس وقت کی صورت حال کے مناسب ہوتی،

ان نازک ایام میں جملہ صوبہ داری مجالس مقننہ پر مالی مشکلات کے بادل چھائے رہے ۱۹۲۳ء میں صرف ایک یا دو صوبہ اپنے موازنہ کے آمد و خرچ کو برابر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور اگر تمام صوبوں کے جملہ آمد و خرچ کو ایک دوسرے سے منہا کیا جائے تو آمد سے خرچ بقدر ۸ کروڑ روپیہ کے زیادہ رہا۔ اکثر مجالس مقننہ نے جدید محصولوں کے نفاذ کی منظوری دینے میں سخت ترین ناراضگی کا اظہار کیا؛ مدراس میں مقامی ضروریات کے لئے ایک مقامی محصول کے احیاء کی تجویز مسترد کر دی گئی[1]۔ بمبئی میں قانون کاغذات مہور (اسٹامپ) کی

[1] ایک دوسرے موقع پر مدراس کی مجلس مقننہ نے ۱۰ کے مقابلے میں ۶۲ رائوں سے اس مضمون کی ایک تحریک منظور کی، کہ اس صوبہ میں بندوبست دوامی کیا جائے۔

ترمیم آمدنی میں اضافہ کی خاطر کی گئی، لیکن محصول تماشہ کا مسودہ پہلی ہی خواندگی میں مسترد کر دیا گیا۔ صوبجات متوسطہ اور صوبجات متحدہ میں قانون رسوم عدالت کی اس ترمیم کو جس کے ذریعہ آمدنی میں اضافہ ہو سکتا تھا، پہلی ہی خواندگی میں نامنظور کر دیا گیا۔ لیکن دوسری طرف بنگال میں اسی قسم کی محصولی تجاویز (جن میں محصول تماشہ بھی شامل ہے) منظور کر لی گئیں۔ لوگوں کی توجہ تخفیف کی طرف منعطف بھی اور متعدد صوبوں میں تخفیفی کمیٹیاں (اور بنگال میں پولیس کی تخفیفی کمیٹی) مقرر کی گئیں بعض جگہوں پر موازنہ میں غیر ذمہ دارانہ انداز سے کمی کی گئی، اس میں سب سے زیادہ بنگال میں ہوا جہاں اخراجات پولیس میں ۲۳ لاکھ روپے (یعنی مطالبہ کا ⅛ واں حصہ) کی کمی کر دی گئی لیکن بعد میں ضمنی رقوم کی شکل میں یہ رقم منظور کر لی گئی۔ بعض صوبوں میں جہاں مجلس مقننہ نے محفوظہ محکموں کے اخراجات کی منظوری سے بھی انکار کر دیا تھا، گورنر کو اپنے خاص اختیارات کے ماتحت ان رقوم کو بحال کرنا پڑا۔[1]

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم کو آٹھ صوبوں سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، تو ہم کو نظر آتا ہے کہ ایسی حالت میں تعمیم رائے ایک خطرناک چیز ہوگی پھر بھی اجمالاً اتنا کہا جا سکتا ہے، کہ ان صوبہ داری مجالس مقننہ نے اب تک سیاسی و مالی حقائق کے معلوم کرنے میں بہت کم صلاحیت کا اظہار کیا، ان کی قوت فیصلہ میں توازن

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۷۶)) اس کے معنی یہ ہوئے، کہ اب تک آمدنی کا ایک ایسا ذریعہ ناقابل تبدیل ہو جائے جس میں کمی یا زیادتی کی کافی صلاحیت ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ خود بنگال میں اس بات پر غور کیا جا رہا ہے، کہ کیا خود مجلس مقننہ کو (اپنے استحقاق عام استعمال کر کے) اس بات کا حق حاصل نہیں کہ صوبہ کے دیرینہ دائمی بندوبست کو منسوخ کر دے۔

[1] بنگال میں لارڈ رانلڈ شے نے مجلس مقننہ کی توجہ مسودۂ قانون اصلاحات کی متفقہ منتخب کمیٹی کی رپورٹ کے مندرجۂ ذیل جملہ کی طرف منعطف کر دی تھی "کمیٹی اس بات کو واضح طور سے بتا دینا چاہتی ہے کہ یہ اختیار حقیقی ہے، اور اس کے استعمال کو غیر معمولی یا غیر دستوری نہ سمجھنا چاہیئے"۔

بہت کم تھا، اور ایسے دور از کار مباحث میں پڑ کر جو فرقہ وارانہ رنگ میں رنگے ہوں گے اصل موضوع سے دور ہو جانے کا امکان تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے مرکزی جماعت مقننہ کے مقابلہ میں اپنے فرائض کی ادائی میں بہت کمی کی واقعہ یہ ہے کہ جہاں ملک کے اکثر بہترین دماغ مرکزی جماعت مقننہ میں پائے جاتے ہیں، وہاں ایسے ارکان کی صوبہ داری مجالس میں بہت کمی ہے، جو محنت ولیاقت میں ان کے مساوی ہوں۔ قبل اس کے کہ اس بات کا دعویٰ کیا جائے، کہ صوبے پورے خود مختاری کے لائق ہو گئے ہیں، ہم کو اس کمزوری کا علاج اور اس کمی کی تلافی کرنا پڑیگی۔

باب (۷)

تحریک عدم تعاون و ترک موالات

ہم دیکھ چکے ہیں، کہ ۱۹۱۸ء کی اصلاحات کی اسکیم کے شایع ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ، قوم پسندوں میں تفریق پیدا ہو گئی! اعتدال پسند انڈین نیشنل کانگریس سے الگ ہو گئے۔ اور انھوں نے نیشنل لبرل فیڈریشن کے نام سے اپنی الگ مجلس قائم کی جس کا پہلا سالانہ اجلاس ۱۹۱۸ء میں ہوا اس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں، جو کہ قانون ہند ۱۹۱۹ء کے منظور ہو جانے کے چند دنوں بعد ہوا مندرجۂ ذیل تجویز منظور کی گئی:۔

"یہ کانفرنس اعلیٰ حضرت ملک معظم کی خدمت میں، اپنی انتہائی عقیدت اور احسان مندی کی نذر پیش کرنا چاہتی ہے، کہ ان کے ۲۳ دسمبر ۱۹۱۹ء کے اعلان نے برطانوی ہند کی تاریخ میں ایک جدید باب کا اضافہ کر کے ذمہ دارانہ حکومت کے آغاز کا دروازہ کھول دیا ہے"

"اگرچہ یہ کانفرنس مرکزی حکومت میں کسی قسم کے ذمہ دارانہ حقوق کی ترویج کے فقدان پر افسوس کا اظہار کرتی ہے، پھر بھی ۱۹۱۹ء کے قانون ہند کا اس حیثیت سے خیر مقدم کرتی ہے، کہ وہ ترقی پذیر ذمہ دارانہ حکومت

کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ کانفرنس ملک کے تمام فرقوں یوروپی وہندوستانی۔ سرکاری وغیر سرکاری سے درخواست کرتی ہے، کہ وہ اس قانون کو کامیاب بنانے کے لئے دل سے تعاون کریں۔

اعتدال پسندوں کے اس اعلان کے بالکل مغایر وہ تجاویز ہیں جو اسی زمانے میں انڈین نیشنل کانگرس نے اپنے اجلاس امرتسر میں منظور کیں۔ وہ یہ ہیں :-

"یہ کانگرس اپنے گزشتہ سال کے اس اعلان کو کہ ہندوستان مکمل ذمہ دار حکومت کے قابل ہے، پھر دہراتی ہے، اور اس بیان کے خلاف جو کچھ بھی فرض کیا جائے یا بیان کیا جائے اس کی تردید کرتی ہے"۔

"یہ کانگرس اپنی اس تجویز پر قائم ہے جو اس نے آئینی اصلاحات سے متعلق دہلی کانگرس میں منظور کی تھی۔ اور اس کا خیال ہے کہ قانون اصلاحات ناکافی غیر اطمینان بخش اور مایوس کن ہے"۔

"یہ کانگرس اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہے، کہ پارلیمنٹ کو چاہیے کہ وہ اصول خود ارادیت کی بنا پر جلد از جلد ہندوستان میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرنے کی طرف قدم بڑھائے"۔

"اس کانگرس کو امید ہے کہ اس وقت تک کے لئے کہ ذمہ دار حکومت رائج ہو جائے، موجودہ قانون پر اس طرز سے عمل کیا جائے گا۔ کہ جس سے مکمل ذمہ دار حکومت قریب تر آجائیگی، اور یہ کانگرس رائٹ آنریبل ایڈون مانٹیگو کا اس کوشش کے لئے شکریہ ادا کرتی ہے، جو انھوں نے اصلاحات سے متعلق کی ہے"۔

"آخری تجویز پر سخت بحث رہی۔ ایک جماعت کی خواہش تھی، کہ وہ قانون اصلاحات سے بےتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے مسٹر مانٹیگو اور ان کی تمام مساعی سے انکار کردے، دوسری جماعت نہ تو وزیر ہند کی اعتدال پسندانہ ہمدردی کو کھونے پر رضامند تھی، اور نہ یہ چاہتی تھی۔ کہ جو اصلاحات حکومت میں عنقریب رائج ہونے والی ہیں ان سے علیحدگی کی ذمہ داری لے۔ ان دو جماعتوں کے اختلاف رائے کی جھلک دوسری اور تیسری تجویز میں بھی موجود ہے" ۱۹۱۹ء

کی تجویز دہلی میں جس کی پہلی تجویز کے ابتدائی حصہ میں دوبارہ تصدیق کی گئی، نیشنل کانگرس نے مطالبہ کیا تھا، کہ صوبوں کو فوراً سوارج دے دیا جائے اور اس بات کی دستوری ضمانت دیجائے، کہ پندرہ سال بعد ہندوستان کو مکمل خود مختارانہ حکومت دیدی جائے گی؛ دوسری جماعت کا خیال تھا، کہ حکومت کے جدید نظام سے کام نکالا جائے اس لئے کہ وزیر ہند اور پارلیمنٹ پر اثر ڈالنے اور ان سے اپنے مطالبات منظور کرانے کا یہی موثر ذریعہ ہے لیکن تیسری تجویز جو خود ارادیت کے اصول پر زور دیتی ہے، ایک ناقابل مفاہمت شکل پیش کرتی ہے، اور یہ فی الواقع ان اصولوں سے جو پارلیمنٹ نے قانون اصلاحات کی تمہید میں بیان کئے ہیں، بالکل جداگانہ شے ہے۔ عملاً یہ تجویز پارلیمنٹ سے اس بات کا مطالبہ کرتی ہے، کہ وہ ہندوستان کے مرتبہ کے سوال پر از سر نو غور کرے، اور سیاسی مستقبل کے تعین کے معاملہ کو خود ہندوستانیوں ہی پر چھوڑ دے۔ جس جماعت کی یہ رائے ہے، اس کے خیال میں قانون اصلاحات کو قبول کرنا، اور اصلاح شدہ نظام حکومت میں حصہ لینا اس بات کا مترادف ہے، کہ کانگرس نے اپنی تجاویز کے ذریعہ جس سیاسی عقیدہ کا اظہار کیا، اس سے انکار کر دیا جائے[1]۔

کچھ دنوں کے لئے تو ہندوستان کے لئے اصول خود ارادیت کے حامی خاموش رہے؛ لیکن ستمبر ۱۹۲۰ء میں کانگرس کے اجلاس نے آئندہ انتخابات کے مقاطعہ کا فیصلہ کر دیا، اور دسمبر کے سالانہ اجلاس ناگپور میں دستور کانگرس کی اہم ترین دفعہ میں ایک ایسی تبدیلی کی گئی، جس سے اس جماعت کے سیاسی عقیدہ کے متعلق تمام شبہات دور ہو گئے۔ اب یہ طے کر دیا گیا، کہ

---

[1] کانگرس نے تو زمانہ ہوا، اپنے ۱۹۱۷ء کے سالانہ اجلاس ہی میں اغیار (یعنی پارلیمنٹ) کے اس دعوی کی تردید کر دی تھی کہ ان کو اس بات کا کوئی حق بھی حاصل ہے کہ وہ ان مراتب کا تعین کرے جس کے ذریعہ حکومت خود اختیاری حاصل کیجائیگی؛ کیونکہ یہ مسلمہ اصول ارادیت کے سراسر نفی کے مترادف ہوگا۔

انڈین نیشنل کانگرس کا مقصد یہ ہے، کہ "تمام جائز و پرامن ذرائع سے ہندوستانی اپنے ملک کے لئے سواراج حاصل کریں" نہ صرف یہ کہ برطانوی سلطنت میں ہندوستان کے دستوری مرتبہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا، بلکہ اس سے بڑھکر یہ ہے کہ سابق دستور میں اس بات کا جو اعلان تھا، کہ "کانگرس کا مقصد موجودہ نظام حکومت میں تدریجی اصلاح کے ذریعہ" حاصل کیا جائے گا وہ بالکل حذف کر دیا گیا۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ناگپور کے اجلاس میں اکثریت نے اقلیت کے ساتھ کسی قسم کی رواداری کا ثبوت نہیں دیا۔

انڈین نیشنل کانگرس دوسرے سال کے آخر تک انقلابی جماعت نہیں بنی۔ اب نومبر ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے (جو کانگرس کی اعلیٰ ترین مجلس عاملہ تھی) مندرجۂ ذیل تجویز منظور کی[1]

"چونکہ اس قومی ارادہ کی تکمیل میں کہ سال بھر کے اندر سواراج قائم کر لیا جائے، ایک مہینہ سے زیادہ نہیں رہا ہے، اس لئے آل انڈیا کانگرس کمیٹی ہر صوبہ کو اس بات کا اختیار دیتی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری پر جس میں محصولوں کی عدم ادائی بھی شامل ہے، اس صوبہ کی کانگرس کمیٹی کے مجوزہ بہترین طریقہ پر قانون شکنی کر سکتا ہے"[2]

---

[1] مندرجۂ ذیل تجاویز بھی منظور کی گئیں۔ پہلی تجویز میں ان مساعی کی اجازت دی گئی جو ہندوستانی فوج کی وفاداری کو برباد کرنے کے لئے کی جا رہی تھیں دوسری دلچسپ تجویز ترکی اور افغانستان جیسی اسلامی ریاستوں کو پیش نظر رکھ کر اس مطالبہ پر مبنی تھی کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کے خارجی امور کی نگرانی کا بھی اختیار ہونا چاہئے۔

"آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی رائے ہے، کہ ہر شہری کا یہ قانونی حق ہے، کہ وہ سپاہیوں اور ملکی ملازموں سے اس بات کی درخواست کرے، کہ وہ ایسی حکومت سے جس نے ہندوستان کی آبادی کی اکثریت کے اعتماد کو کھو دیا ہے قطع تعلق کر لیں"

"آل انڈیا کانگرس کمیٹی تمام بیرونی مملکتوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہتی ہے کہ

اس قرارداد کے چند ہفتوں بعد ہی کانگرس کے سالانہ اجلاس احمدآباد میں اس تجویز کی توثیق کی گئی، اس کے علاوہ دو اور قراردادیں بھی منظور کی گئیں، اور انھوں نے اس تبدیلی کو مکمل کر دیا۔ ایک تجویز کا مقصد یہ تھا، کہ کانگرس اپنے تمام دوسرے کاموں کو ملتوی کر کے صرف "قانون شکنی" ہی کے فرائض انجام دے خواہ یہ قانون شکنی جماعتی ہو یا انفرادی، اقدامی ہو یا دفاعی؛ دوسری تجویز کے ذریعہ مہاتما گاندھی (اور ان کے قید ہو جانے کی صورت میں ان کے نامزد کردہ جانشین) کو غیر محدود عاملانہ اختیارات دیدیے گئے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ قابل ذکر شرط بھی لگادی گئی کہ کانگرس کے خصوصی اجلاس کے استصواب کے بغیر، حکومت ہند یا برطانوی حکومت سے کسی قسم کی "شرائط صلح" طے نہیں کی جاسکتیں۔

اب ہم یہ دیکھ چکے، کہ قوم پرستوں کی اصلاحات کی مخالفت نے تدریجاً اپنے کو مروجہ حکومت کے خاتمہ کی تحریک کی صورت میں بدل دیا؛ اب اس بات پر غور کرنا باقی ہے کہ اس تحریک نے دستوری ترقی کی منظم رفتار میں (جو ہماری کتاب کا موضوع ہے) کیا کیا خرابیاں پیدا کیں۔

سب سے پہلے اس بات کو واضح طور سے ذہن نشین کرلینا چاہیئے، کہ دستوری و انقلابی قوم پرستوں میں تفریق ہو چکی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اول الذکر اصحاب میں سے بعض نے نہایت پرزور الفاظ میں اس بات کا مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو سوراج دینے کی رفتار کو تیز تر کر دینا چاہیئے، لیکن اس کے اسباب مختلف تھے۔ بعض تو ایمانداری سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ موجودہ بے چینی کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں ہے، بعض انقلابی جماعت کے تکلیف دہ دباؤ کی وجہ سے ایسا کرتے تھے، اور بعضوں کا اس سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۲)۔ جب ہندوستان کو سوراج حاصل ہو جائیگا تو وہ اپنی خارجی حکمت عملی میں ہمیشہ ان کے مذہبی خیالات و جذبات کا لحاظ رکھے گا۔

۱؎ قانون شکنی کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے بعض ابتدائی شرائط کی تکمیل لازمی تھی، لیکن یہ زیادہ تر خیالی ہی قسم کے تھے۔

سوا کوئی مقصد نہیں تھا کہ حکومت کی موجودہ پریشانی سے انتہائی فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن اگرچہ اس وقت صورت حال ایسی ہی تھی لیکن اعتدال پسند گروہ نے ہندوستان کے آئینی ارتقاء کے لئے بعض اصول جماعتی حیثیت سے پیش کئے ہیں۔ اور وہ مفصلۂ ذیل ہیں ؂۱:-

(۱) ہندوستان کی آئندہ حکومت، موجودہ حکومت کی ہی تبدیل شدہ صورت ہونا چاہیئے۔

(۲) ہر مرتبہ اس قسم کی تبدیلی کے وقت پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کو ہی کام میں لانا چاہیئے۔

(۳) اگر ہندوستان کو سواراج کی راہ کو سلامتی سے طے کرنا ہے تو نظام حکومت کے برطانوی عنصر کو سرعت کے ساتھ فنا نہ کرنا چاہیئے۔

؂۱ ہندوستان کے ایک اعتدال پسند اخبار کے حال کے لکھے ہوئے، ایک مقالہ کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے اس جماعت کے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق جو خیالات ہیں ان پر اسقدر واضح و کافی روشنی پڑتی ہے کہ میں اس زاویۂ نگاہ کو بیان کرنے کے لئے یہاں اسے نقل کردینا ہی مناسب سمجھتا ہوں:-

"کیا وہ ہندوستانی جو ۱۲ سو برس سے غلام چلے آئے ہیں، چند سال اور بھی انتظار نہیں کر سکتے؟ اور کیا برطانوی عزت، برطانوی شہنشاہ اور پارلیمنٹ کے حتمی وعدوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے جنھوں نے نہایت واضح الفاظ میں ہندوستان کی آزادی کے پیدائشی حق کو تسلیم کرلیا ہے۔ تو کیا اس کا یہی بدلہ ہے کہ ہم اہل برطانیہ کو اپنا دشمن سمجھیں، اور کیا اسی لئے ایک ایسے ملک سے اعلان جنگ کیا جائے کہ اس کے لایق فرزند ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لئے مصروف رہے، اور انھوں نے ہی ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی و خود اختیاری حکومت کے خیالات پیدا کئے ہیں، اور ان کی حکومت کی تاریخ تمام تر اسی منزل مقصود کی طرف گام زن ہے"؟

ان دونوں جماعتوں کی خلیج اختلاف، اصولی سیاسی اختلاف سے بھی زیادہ عمیق تھی۔ انقلابی قوم پرستوں کے پیش نظر نہ صرف ایسا ہندوستان تھا جو تمام دستوری علایق میں برطانوی سلطنت سے بالکل آزاد ہو، بلکہ وہ اسے تمام مغربی اثرات سے بھی آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ قوم پسندوں کے اس عقیدہ کی روشنی میں ہندوستان کی اقتصادی نجات یہی ہے کہ قدیم چرخہ کو رائج کیا جائے اور ان کے نزدیک ہندوستان، خانہ ساز کپڑا پہن کر ایک مرتبہ پھر مغربی سرمایہ داری کے جوئے کو پھینک سکتا تھا۔ مہاتما گاندھی کے آتش زدہ ولایتی کپڑوں کے ڈھیر اس کا منظر ہیں۔ اس کے علاوہ اس خیال کے لوگوں کے نزدیک ہندوستان کی روحانی نجات اور اس کی مغربی مادیت کے پھندے سے آزادی صرف اسی طرح حاصل کی جاسکتی ہے، کہ نظام تعلیم میں جو بیرونی عنصر ہے اسے نکال دیا جائے[1] لیکن اگر انقلابی قوم پرست اس طرح سے متحد تھے تو ان کے مقابل معتدل قوم پرستوں کے عقیدہ میں بھی۔ اتفاق تھا، چنانچہ ان کے خیال میں ہندوستان کا سیاسی مستقبل علیحدگی کے بجائے، برطانوی شہنشاہیت کے تمام ممالک کے ساتھ مساویانہ اشتراک عمل کے اتحاد میں مضمر تھا، ان کے خیال میں ملک کا معاشی اور روحانی مستقبل قرون وسطیٰ کی طرف مراجعت کی جگہ مغربی طریقۂ کار کی مردانہ تقلید پر مبنی تھا صنعتی ترقی اور ذہنی وسعت کے لئے ہندوستان کو مغرب سے ملنے کی ضرورت تھی، پس اگر ہندوستان کو اپنا مکمل قومی مرتبہ

---

[1] ڈاکٹر ربندر ناتھ ٹیگور نے قومیت کی اسی حیثیت کے متعلق کہا ہے کہ تمام دنیا اس بری ذہنیت کے ظلم کے خوف سے کانپ رہی ہے، اور اپنے ایک خط میں (جو حال ہی میں ایک بنگالی رسالہ پرباسی میں شایع ہوا ہے) لکھا ہے کہ جب میں نے دیکھا کہ مہاتما گاندھی بھی ہماری خواتین کو اس بات سے منع کر رہے ہیں، کہ وہ انگریزی نہ پڑھیں تو مجھے نظر آنے لگا کہ ملک کے چاروں طرف ایک دیوار کھینچی جارہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہماری نجات اس میں مضمر ہے، کہ ہم اپنے گھروں کو قیدخانے بنادیں، ہم نے بیرونی دنیا کی تمام روشنی کو نکال کر اپنے گھر کی تاریکی کی پرستش شروع کردی ہے۔"

حاصل کرنا تھا، اور تمام دوسری ہمسایہ قوموں سے بلند تر ہونا تھا، تو اعتدال پسندوں کے خیال کے مطابق نہ صرف انتظام حکومت میں اہل برطانیہ اور ہندوستانیوں کو ساتھ رہنا تھا، بلکہ نہر و ریلوے، انجنیرنگ، سرمایہ داری مہاجنی اور تعلیم میں بھی ان کا اشتراک عمل بیا ضروری تھا۔

مختصراً یہ اختلاف ان دو جماعتوں میں تھا، جن میں ایک نہایت پرجوش طریقہ سے مغربی اثر کو دور کرکے ایک خالص ہندوستانی تمدن کو جاری یا رائج کرنا چاہتی تھی، اور دوسری کا خیال تھا، کہ اگر ہندوستان کو تاریخ عالم کے اس موقع پر کسی ایسے تمدن کا جو اس کے نام کے شایان شان ہو، مالک ہونا ہے، تو مغرب و مشرق دونوں کو اس کی تعمیر میں مل کر کام کرنا چاہیئے۔

پس پہلی چیز جو ہم کو یاد رکھنا چاہیئے یہ ہے کہ انقلابی تحریک کی حقیقی خصوصیت عام سطح کے نیچے تھی، اور جب تک ہم اسے اس عمق میں تلاش نہ کریں گے، ہم ابھی بھی اس کو پا نہ سکیں گے۔ دوسری بات یہ ہے، کہ ہمارے نزدیک انقلابی قوم پسندوں کی اپیل کے مخاطب عموماً جاہل عوام الناس تھے۔ ہمارے نزدیک اکثر تعلیم یافتہ طبقوں نے جو برطانوی تعلق کی قدر و قیمت سے واقف تھے، اور ایک مستحکم حکومت کی ضرورت کے قائل تھے، ان کی درخواستوں پر مطلق توجہ نہ کی۔ لیکن ہم یہ حکم آنے والی نسل پر نہیں لگا سکتے[1] اور یہ واقعہ مستقبل کے لئے ایک بڑی اہمیت رکھتا ہے انقلابی تحریک نے مہاتما گاندھی، کلکتہ کے مشہور قانون داں مسٹر سی آر داس پنجاب کے لالہ لاجپت رائے، اور صوبجات متحدہ کے پنڈت موتی لال نہرو کے علاوہ دوسرا کوئی ایسا مشہور رہنما پیدا نہیں کیا۔ رہے کانگرس کے قدیم رہنما، ان میں سے بعضوں نے تو اپنے تعلقات منقطع کرلئے اور بعض انکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

[1] معلوم ہوتا ہے کہ انقلابی قوم پرستی جو مخالف برطانیہ جذبات میں ڈوبی ہوئی ہے ایسے ہندوستانی طلبہ میں زیادہ تر سرایت کئے ہوئے ہے جو غیر ممالک میں مثلاً برطانیہ عظمیٰ اور امریکہ میں تعلیم پارہے ہیں۔ ان کا اصول یہ ہے کہ ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے ہے۔

تعلیم یافتہ طبقوں کو اپنے ساتھ لیجانے میں ناکامیاب رہنے پر انقلاب پسند قوم پرستوں نے عوام کو اپنا مخاطب بنایا، اور عرصے تک وہ تمام ملک میں (شہروں میں اور بعض دیہات میں) انھیں کو عدم تعاون و تعاون کا سبق پڑھا رہے ہیں، اور جہاں کہیں بھی موقع ملتا ہے موجودہ حکومت سے ان کو ٹکرانے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں۔ جائنٹ رپورٹ کے مصنفین نے ایک جملہ میں جو اکثر نقل کیا جاتا ہے لکھا ہے کہ[1] "عوام کے پرسکون قناعت کی وہ زمین نہیں ہے جس میں ہندوستانی قومیت کا درخت جڑ پکڑ سکے، اور اس سکون کو عمداً توڑ کر ہم ہندوستان کی بہبودی کی اعلیٰ خدمت انجام دے رہے ہیں"! آگے چل کر وہ لکھتے ہیں[2] "اگر ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کو اس الزام سے بچنا ہے، کہ وہ صرف اپنی جماعتوں کے مفاد کی نمائندگی کرتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ وہ اپنے ملک کے عوام ہی کو اپنا مخاطب بنائیں، اور انھیں کو اپنا مقصد سمجھائیں"! یہ بھی عجیب نیرنگی واقعہ ہے، کہ اس راہ کی طرف جو پہلا قدم اٹھایا گیا، وہ اس جماعت کا تھا، جو عمداً موجودہ حکومت کو بدنام مفلوج و معزول کرنے کی کوشش کر رہی تھی!

اس تحریک کو جو کامیابی حاصل ہوئی، خواہ یہ وقتی کیوں نہ ہو، اس کا اندازہ اس عام ہڑتال سے ہوتا ہے جو شمالی ہند کے اکثر مقامات پر اس دن کی گئی جب کہ شہزادہ ولیعہد برطانیہ بمبئی پہنچے! (۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء) کا یہ مظاہرہ صرف بڑے شہروں تک محدود نہ تھا۔ مانا کہ یہ اپیل عوام کے سریع الاعتماد طبقہ سے ہی کی گئی تھی، اور ان کو بتایا گیا تھا، کہ اس سال کے خاتمے سے پہلے سوارج کا اعلان ہو جائے گا، اور اس کے ساتھ ہی غلہ اور کپڑا سستا ہو جائے گا، ریل کے پاس "مفت" ملنے لگیں گے لگان نہ سہی دوسرے محصول تو یقیناً معاف ہو جائیں گے۔ یہ واقعہ کہ انقلابی تبلیغ میں بعض مرتبہ تخویف و تحریص اور ہر قسم کی معاشرتی سزا کا عنصر

---

[1] پارہ ۱۴۴۔
[2] پارہ ۱۸۵۔

شامل تھا ہمارے موجودہ مقصد کے حصول میں ممد نہیں ۔ اس وقت ہمارا مقصد اس تحریک اور صرف اس تحریک سے اور اس عام کامیابی سے جو اسے حاصل ہوئی، وابستہ ہے اور یہ سیاسی عنصر اپنے اندر بہت کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر طبقہ کی ہندوستانی خواتین میں سخت ترین ایسی قومی روح کا سرایت کرنا جو یوروپیت کے خلاف تھی ایک دوسرا عظیم الشان خطرناک اہم واقعہ ہے[1]۔

اب اسکیم اصلاحات کی تمام تر کامیابی حکام (جن میں اب ہندوستانیوں کو بھی شامل کرنا چاہئے) اور محکموں کی باہمی مفاہمت اور اعتماد کی موجودگی پر منحصر ہے اگر محکوم کو یہ سمجھایا جائے کہ وہ ایک خارجی حکومت کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں تو ایسی حالت میں کوئی مستحکم اور ترقی پذیر حکومت اگر بالکل ناممکن نہیں تو بے انتہا مشکل ہو جائیگی[2]۔ اس زمانے کے پرآشوب مہینوں میں پولیس نے ملک کے ہر حصہ میں نہایت ہی نازک ترین مواقع پر

---

[1] مجلس خواتین میں جو (انڈین نیشنل کانگرس کی ایک شاخ ہے) اور جو دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں منعقد ہوئی تھی، ۔۔۔۶ نائبات نے شرکت کی تھی، حیدرآباد دکن کی ممتاز شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو جیسی خطیب و پرجوش سیاست داں بی بی اس تحریک کی رہنما تھیں۔

[2] اگر ہم تارکان موالات کے مطالبات کو واضح طور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا مقصد یہ تھا برطانوی اقتدار اور برطانوی فوج ہندوستان سے بالکل ہٹ جائے، مختصراً یہ کہ ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے ہونا چاہئے"۔ یہ بات بڑی حد تک قابل بحث ہے کہ شمالی مغربی سرحد کی طرف سے جو خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے، اس کو نظرانداز کرنے کے بعد بھی کیا ایسی حالت میں جب کہ خود اندرون ملک اس قدر افتراق ہو اور جس کی وجہ سے ہندوستان کی حکومت ایک لاینحل مسئلہ بنا ہوا ہو، موجودہ حکومت کے عوض ایک ایسی قومی حکومت جو رائے عامہ پر مبنی ہو، ایک دن بھی قائم رہ سکتی ہے۔ پھر دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا دیسی ریاستوں کے طرز کی شخصی قسم کی حکومت اشتراک عمل اور مناسب حالات میں مستحکم اور ترقی پذیر نہیں ہو سکتی؟ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے لئے ایسی حالت میں جب کہ

بھی اپنی قابل تعریف وفاداری ودوراندیشی کا ثبوت دیا، اور ہندوستانی فوج کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ لیکن ان سے ان کی استعداد سے زیادہ کی توقع نہ رکھنا چاہیئے۔ پولس کو ہمیشہ ایک حد تک غیر ہر دلعزیزی سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن ایسے سپاہیوں کے اہل وعیال پر تشدد کرنا جو ملازمت کی وجہ سے غیر حاضر ہوں اور اس قسم کی دوسری کارروائیاں بالکل ہی دوسری چیزیں ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے، کہ یہاں کی حکومت کے انتظام کا تمام بوجھ برطانوی حکام پر ہے، اور اس بات کا خوف لگا رہتا ہے، کہ ان میں سے اکثر عموماً اور حکام ضلع خصوصاً تنہا اور دور دراز مقامات میں رہ کر اپنے فرائض کی انجام دہی کو انسانی قوت سے باہر نہ پائیں۔

اس کا نتیجہ بہت صاف اور واضح ہے۔ ہندوستان کا سیاسی مستقبل اس جماعت پر منحصر ہوگا جو عوام کی معتمد علیہ ہوگی تو کیا پھر ان کو انقلابی قوم پرستوں کی تبلیغ کا شکار ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے، یا پھر ان کو کوئی پر امید اور اس سے زیادہ تعمیری ذریعہ سے کیوں نہ اپنی طرف متوجہ کیا جائے؟ اگر موخر الذکر صورت قابل قبول ہے تو اعتدال پسندوں کو عوام کی سیاسی تعلیم کا انتظام کرنا ، اور عدم تعاون کے دلدادوں سے مقابلہ کرنا چاہیئے بلاشبہ حکومت بھی کاشتکاروں اور مزدوروں کی شکایات کو ہوشیاری وہمدردی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۸) حکومت کی مخالف تحریک کامیاب ہوجائے، یہ صورت بھی پیش کی گئی تھی، کہ برطانوی صوبوں کو دیسی ریاستوں میں شامل کر دیا جائے، یا ہندوستانی والیان ریاست کے ماتحت دیدیا جائے۔

لے۔ صوبۂ بہار واڑیسہ اور مدراس پریسیڈنسی کی پولیس میں کچھ بددلی پیدا ہوگئی تھی، لیکن اس کا سبب سیاسی نہیں بلکہ معاشی تھا۔ بنگال میں تحریک خلافت کے زیر اثر بعض مسلمان ارکان پولیس نے استعفا دیدیا تھا، ہندوستانی فوجی سپاہی کو جب کہ وہ عملاً اپنی پلٹن کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا ہو، اس قسم کے نامناسب اثر سے آسانی سے بچایا جاسکتا ہے۔ لیکن مبلغین نے ان کو ان کے گھروں پر تعطیل کے موقع پر جالیا، اور اسکی وجہ سے باغیانہ رویہ کے چند واقعات پیش آئے۔

کے ساتھ دور کر کے بہت کچھ کر سکتی ہے، لیکن مصمم الارادہ و مخلص رہنما اس سے کہیں زیادہ کر سکتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی دفتریت کی ایک لعنت ہے کہ لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے، کہ حکومت ہر کام کر سکتی ہے، اور اسے کرنا چاہئے، اور عام لوگوں سے جو کچھ توقع ہو سکتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ وہ اس کی واضح تنقید کر سکیں۔ اعتدال پسندوں کو اس خیال کو چھوڑ دینا پڑے گا کیونکہ یہ ان کا فرض ہے، کہ قانون کے نفاذ اور امن کے قیام میں وہ حکومت کا ہاتھ بٹائیں، پولیس کے خطرناک و صبر آزما فرائض کی ادائی میں ہمت افزائی کریں، اور مفاہمت و رواداری اور نیک نیتی کی فضا پیدا کریں؛ اس لئے کہ صرف انھیں حالات کے اندر وہ ہندوستان کے تجربہ کار برطانوی حکام کی خدمات کو اس مشکل ترین عہد تغیر میں باقی رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اعتدال پسندوں کے لئے یہ کام آسان نہ ہو گا اور اس سے ان کو عام ہر دلعزیزی حاصل نہ ہو سکیگی۔ انھیں اس مسئلہ کے لئے جسے وہ ایک قومی مسئلہ سمجھتے ہیں، غلط فہمیوں، بدزبانیوں اور معاشری تشدد کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اصلاحات کی مکمل کامیابی اب تمام تر اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کامیاب ثابت ہوں، اور اپنے ابنائے وطن کو اس بات کا یقین دلا دیں، کہ ان کے زاویۂ نگاہ میں نہ صرف عقل اور سمجھ بلکہ جملہ امیدیں جمع ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں وہ صرف یہ ہیں، کہ کسی نہ کسی قسم کے استبداد (خواہ وہ ہندوستانی ہو، یا برطانوی) کی طرف پھر عود کیا جائے، یا پھر ملک میں بدامنی اور تاراج پھیل جائے۔

انقلابی تحریک کے حال کے مختلف مدارج کی وجہ سے عام حالات میں جو تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، ان کی گزشتہ پاروں میں تحلیل کرنے کے بعد اب صرف اس کی تاریخی حیثیت باقی رہجاتی ہے، چنانچہ تحریک عدم تعاون کے واقعات سے جو اب ہم بیان کرتے ہیں یہ کمی پوری ہو جائیگی۔

مہاتما گاندھی نے ابتداءً ۱۹۲۰ء میں اولین مرتبہ مشہور پر جوش مسلمان بھائیوں یعنی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی سے تعلقات

پیدا کر کے تحریک عدم تعاون کی رہنمائی اپنے ذمہ لی، اور دسمبر میں انڈین نیشنل کانگرس کے ایک خاص اجلاس کے ذریعہ کثرت رائے سے ترک موالات کے لائحہ عمل کو منظور کرایا، اور پھر ناگپور کے دسمبر کے اجلاس میں اس کانگرس پر پورے طور سے تسلط جما کر اس لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے پر آمادہ کر لیا۔

مہاتما گاندھی کی ممتاز شخصیت کے متعلق ہم کو دو ایک لفظ کہنے چاہئیں وہ جنوبی افریقہ میں ایک بیرسٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ۴۵ سال کی عمر میں تقریباً ۲۰ سال کے غیاب کے بعد آخر ۱۹۱۴ء میں ہندوستان واپس آئے۔ اس وقت تک وہ نٹال اور ٹرانسوال کے ہندوستانی مزدوروں اور تاجروں کے ایک پکے اور سچے رہنما تھے۔ ان کو انھوں نے مقاومت کے لئے منظم کیا تھا، اور انھوں نے ان کی اس مقاومت میں رہنمائی کی تھی جو انھوں نے سیاسی مجبوریوں اور قومی امتیازات کے جس کے وہ شکار ہو رہے تھے ہٹانے کے لئے کی تھی یہ طویل کشمکش جو ۱۹۰۶ء میں شروع اور ۱۹۱۳ء میں ختم ہوئی، عدم تشدد کی حکمت عملی اور قانون کی علانیہ خلاف ورزی کی وجہ سے مشہور آفاق ہو گئی۔ یہی وہ تحریک تھی جسے اب گاندھی جی نے ہندوستان میں رائج کرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ جب لوٹے تو ان کو اس بات کا کامل یقین تھا، کہ ہندوستان کو مغربی تمدن کے اثرات سے بچانے کے لئے بسا ضروری ہے، کہ ہندوستان کو سوراج مل جائے اور انھیں اس بات پر ایمان تھا، کہ جب دوسرے تمام وسائل ناکامیاب ثابت ہوں، تو اس قسم کی خلاف ورزی قانون یقیناً موثر ثابت ہو گی۔ مہاتما گاندھی ہی کی وہ ہستی ہے، جس نے ایک روحانی معیار پر پورا اترنے کے لئے اپنے تمام دنیاوی فوائد کو ترک کر دیا ہے۔ وہ اپنی خانگی زندگی میں ایک درویش صفت ہیں، اور کسی دوسری غرض کے بغیر محض تحمل مصائب کو ایک روحانی دولت سمجھتے ہیں۔ ہندوان کی انھی اسباب کی بنا پر عام طور سے عزت کرتے ہیں، اور ان کے پیرو صرف سیاسی عقائد کی وجہ سے نہیں، بلکہ بڑی حد تک

مذہبی جذبات کی وجہ سے پیروی کرتے ہیں۔ وہ عدم تشدد یا "اہنسا" کی انتہائی شکل اور ہر عام شخص میں نیکی کی موجودگی کے عقائد میں گویا ٹالسٹائی کے ہمخیال ہیں۔ سیاسی باریکیوں کے لئے ان میں اپنی قوم کے افراد کی سی ذہانت موجود ہے، اور انھیں کسی مدبر کے شوق اقتدار کے ساتھ قانون داں کی لفاظی اور منطقی بحث و مباحثہ سے بھی ایک خاص مسرت ہوتی ہے۔

مہاتما گاندھی ابتدائے جنگ کے بعد ہی ہندوستان واپس آئے اور دوران جنگ میں انھوں نے ہندوستان کی جنگی مساعی میں حکومت کا مسلسل ساتھ دیا۔ انھوں نے ۱۹۱۶ء کے بعد سے مزدوروں اور کاشتکاروں کی شکایتوں کے دور کرنے کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں جو مخلصانہ کوششیں کیں، ان کی وجہ سے وہ قوم کے سیاسی رہنما کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ ۱۹۱۹ء کی ابتدا میں انھوں نے اس سال کے راولٹ قانون کو جسے وہ ہندوستان کی قومی تذلیل سمجھتے تھے، منسوخ کرانے کے لئے سیتا گرہ کی تحریک جاری کی۔ جن لوگوں نے سیتا گرہ کا عہد کیا تھا، ان کو اس بات کا وعدہ کرنا پڑتا تھا، کہ "وہ آخر تک صداقت کی پیروی کریں گے، اور کسی کے جان و جسم و مال کو نقصان پہنچانے سے گریز کریں گے۔ اور اس کے ساتھ وہ ایسے قوانین کی، جن کو متذکرہ خلاف ورزی کے لئے منتخب کیا جائیگا، اطاعت سے انکار کریں گے۔" اس تحریک کی ممتاز خصوصیت ہڑتال تھی، اور اسی سے لوگوں کو تخویف و بدامنی کا موقع ملتا تھا گو گاندھی جی کو طرح طرح کے مشورے دئے گئے لیکن انھوں نے ایک نہ مانی اور برابر بڑے قصبات کے سریع الاثر عوام کے سامنے نہایت پر جوش انداز سے تقریریں کیں۔ دہلی، کلکتہ، اور (خود مسٹر گاندھی کے شہر) احمد آباد میں فسادات و خونریزیاں ہوئیں اور وہ آخر کار پھیل کر پنجاب کے عام ہنگامہ تک پہنچ گئیں۔ گاندھی جی کو اپنی غلطی کا جسے انھوں نے "عظیم الشان غلطی" کے واضح الفاظ میں بیان کیا، اقرار کرنا اور یہ بات تسلیم کرنا پڑی کہ انھوں نے شیطانی قوت کا بہت کم اندازہ کیا تھا آخر کار ستیا گرہ کی تحری

ملتوی کردینا پڑی۔

بدقسمتی سے پنجاب کے (جس نے دوران جنگ میں اپنے کو ہندوستان کے تمام صوبوں سے ممتاز کیا تھا) عام ہنگاموں کے فرو کرنے کی جو کارروائیاں کی گئیں وہ قومی منافرت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں، اور سختیوں نے بعض مرتبہ بربریت کی صورت اختیار کرلی۔ ان میں سے ایک ممتاز موقع پر امرتسر میں جنرل ڈائر نے جو کارروائی کی، اس نے تمام برطانوی روایات کو پس پشت ڈال دیا۔ لارڈ ہنٹر کی کمیٹی کی روداد تک (جو واقعات متعلقہ سے ایک سال بعد شائع ہوئی) کسی کو امرتسر کے واقعات کا مکمل علم نہ تھا۔ مندرجۂ ذیل اسباب کی وجہ سے ہندوستانیوں کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچا۔ اولاً واقعات کی اشاعت میں بہت تاخیر کی گئی۔ دوسرے حکومت نے روئداد مذکور کے نتائج سے متعلق جو کارروائی کی تھی، اسے اس کی نیم دلی پر محمول کیا گیا۔ اور سب سے آخر میں اور سب سے زیادہ افسوسناک جو بات تھی، وہ یہ کہ دارالامراء نے جنرل ڈائر کی کارروائی پر صاد کردیا، اور انگلستان اور ہندوستان کے انگریزوں نے چندہ دے کر ایک کیسۂ زر اور ایک اعزازی تلوار اسے پیش کی۔ میرے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں ہے، جلیانوالے باغ کے افسوسناک واقعات کی وجہ سے جو قومی منافرت پیدا ہوئی وہی قومی تحریک کی سب سے بڑی قوت مہیجہ تھی۔

موسم بہار ۱۹۱۹ء میں شمالی ہندوستان میں، اس عام ہیجان کے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں غیر معمولی اخوت کے مناظر دیکھنے میں آئے، اور اسی وقت سے دونوں قوموں کے انقلابی رہنماؤں کے سیاسی اتحاد کا آغاز ہوتا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں شوکت علی و محمد علی جو دوران جنگ میں اپنی علانیہ ترک پرستانہ حکمت عملی کی وجہ سے نظر بند کردئیے گئے تھے، آزاد کردیئے گئے۔ آزاد ہوتے ہی انھوں نے فوراً اپنے کو تحریک خلافت کا سردار بنالیا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ سلطان روم کو اسلام کے روحانی پیشوا کی حیثیت سے قبل از جنگ والا مرتبہ

دلا دیا جائے[1]۔ اگرچہ حکومت ہند نے مسلمانوں کے مذہبی وقار کو جو صدمہ پہنچایا تھا، اس کے لئے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور اگرچہ اس بات کی کوشش میں کہ ترکوں کے ساتھ صلح کرنے میں ان کے معقول مطالبات کو پورا کیا جائے، کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی، لیکن پھر بھی مخالفین برطانیہ پرجوش علی برادران کی زیر قیادت تحریک خلافت کو بہت کچھ فروغ پہنچا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی بے چینی نے ۱۹۱۹ء کی موسم گرما میں امیر افغانستان کو اس بات کی ہمت دلائی، کہ وہ "برطانوی راج" پر حملہ کریں، اور شمالی مغربی سرحد پر جو مسلسل لڑائی ہوتی رہی وہ اسی عام بے چینی کا مظاہرہ ہیں۔ تحریک ہجرت اس انقلابی تحریک کے اعمال میں سب سے زیادہ افسوسناک بات تھی اور یہ اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ ہزاروں مہاجرین ——جو عموماً سندھ، اور صوبہ شمال مغربی کے غریب مسلمان کسان تھے——سرحد عبور کر کے افغانستان میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہوئے، اور ان میں سے سیکڑوں بھوک اور تکان کی وجہ سے کابل کی راہ میں ختم ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی موسم گرما کا واقعہ ہے۔ ۱۹۲۱ء کے اگست میں موپلوں کی بغاوت رونما ہوئی اور اس کی وجہ سے تمام ملیبار میں موت و غارتگری پھیل گئی، یہ ایک منظم بغاوت تھی۔ "سلطنت خلافت" کے نام سے ایک حکومت قائم کی گئی تھی۔ ان باغیوں کی بربریت تمام تر ہندوؤں کی طرف مرکوز تھی، جن میں سے بہتوں کو تو زبردستی مسلمان بنا لیا گیا اور کئی سو قتل کر دیئے گئے۔

---

[1] برطانوی حکومت پر ایک حد تک صحیح طور پر، وعدہ شکنی کا الزام لگایا گیا ہے ۱۹۱۸ء کی ابتدا میں مسٹر لائڈ جارج نے جو وعدہ کیا تھا اسکے متعلق سمجھا گیا تھا کہ اس کے ذریعہ وزیر اعظم انگلستان نے ترکوں کو ان کے وطن پر علی حالہ قائم رکھنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن صلح کی دفعات سے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ سلطان معظم ایک حقیقی قیدی کی طرح قسطنطنیہ میں رہینگے، اور سمرنا اور مشرقی تھریس یونان کو دیکر اس کے ملک کو منتشر کر دیا جائے گا۔ ہندوستان کے ہر مسلمان کو یہ نظر آنے لگا، کہ یہ صرف برطانوی وعدوں کی تردید ہی نہیں ہے، بلکہ ترکی اور سلطان کے واسطہ سے خود اسلام پر ضرب لگائی گئی ہے۔

ترکی صلحنامہ کی شرائط کی اشاعت کے بعد ہی مہاتما گاندھی نے تحریک خلافت کے رہنماؤں کے ساتھ خریف ۱۹۲۰ء میں اپنی تحریک ترک موالات کا آغاز کیا اور انڈین نیشنل کانگرس کے ستمبر کے خاص اجلاس میں مندرجۂ ذیل امور کو عملی جامہ پہنانے کے متعلق تجاویز منظور کی گئیں :-

(۱) خطابات کی واپسی،

(۲) سرکاری ملازمتوں سے استعفا،

(۳) سرکاری یا امدادی تعلیم گاہوں کا مقاطعہ،

(۴) عدالتوں کا مقاطعہ اور قانون پیشہ اصحاب کا اپنے پیشہ سے علیحدگی،

(۵) آئندہ انتخابات کا مقاطعہ،

(۶) بیرونی اشیا خصوصاً روئی کے کپڑوں کا مقاطعہ،

(۷) پولیس اور فوجی ملازمتوں سے استعفا،

(۸) محاصل (خصوصاً لگان) کی ادائگی سے انکار۔

بیرونی اشیا کا مقاطعہ تدریجی قرار دیا گیا، اور آخری دو باتیں اس تحریک کی آخری منزل طے پائیں۔ ہم انتخاب کے مقاطعہ پر اس سے قبل بحث کر چکے ہیں، رہی ملک کے نظام تعلیم کے خلاف کارروائی جو خود رہنماؤں نے کی تھی وہ بھی ناکام رہی۔ یہ سچ ہے کہ گاندھی جی جہاں کہیں بھی جاتے وہاں لڑکے ان بچوں کی طرح جو ہمیلن کے باجے والے کے ساتھ ہو جاتے تھے اپنے مدارس چھوڑ کر ان کی پیروی کے لئے تیار ہو جاتے، لیکن جوں ہی وہ اس جگہ سے کسی دوسری جگہ کے لئے روانہ ہوتے، اور ان کے نغمہ کی آواز موقوف ہو جاتی، تو ان میں سے اکثر پھر اپنے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے۔ علی برادران کو مشہور مسلم تعلیمی مرکز علی گڑھ میں اور خود گاندھی جی کو ہندو جامعہ کی شہر بنارس میں، نہایت سخت رکاوٹ سے دوچار ہونا پڑا۔ "قومی" اسکولوں اور کالجوں کی تعمیر ملک کے اکثر حصص میں بری طرح ناکام ثابت ہوئی، اور وقتی طور پر سخت ترین انتشار اور بہت سے ہونہار نئیوں کی آئندہ زندگی کی تخریب کے بعد یہ تحریک مقاطعہ

رفتہ رفتہ ختم ہو گئی ہیں دفعات (۱) و (۲) اور (۴) تو ان میں تو اس سے بھی زیادہ مکمل ناکامی ہوئی، اور جن جماعتوں کا ان میں تذکرہ کیا گیا تھا، ان کو مخاطب کرنا ہی چھوڑ دیا گیا۔

نومبر سنہ ۱۹۲۰ء میں حکومت ہند نے اپنی ایک قرارداد شائع کی، جس میں تحریک ترک موالات سے متعلق اپنے عام رویے کا اظہار کیا گیا تھا۔ مقامی حکومتوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ صرف ان اشخاص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کیجائے جو اپنی تحریر یا تقریر کو فساد پھیلانے کے لئے استعمال کریں یا پولیس یا فوج کی وفاداری کو صدمہ پہنچانے کی کوشش کریں۔ حکومت نے جن اسباب کی بنا پر اس تمام ترغیبِ آئینی تحریک کے خلاف تحمل و برداشت کی حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی وہ یہ ہیں،

(۱) حکومت نہیں چاہتی تھی، کہ ٹھیک ایسے وقت جب کہ ہندوستان حکومت خود اختیاری کی طرف قدم بڑھانے والا ہو، اس وقت اس کے مطابع و تقریر کی آزادی میں مداخلت کی جائے۔

(۲) اس بات کا علم کہ جن لوگوں کے خلاف کارروائیاں کی جائیں گی وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے کو شہید ملت بنانے کا موقع نکال لیں گے۔ اور اس طرح ایک غلط ہمدردی حاصل کر کے اپنے پیروؤں کی تعداد بڑھائیں گے۔

(۳) اس بات کا یقین کہ ملک تحریک ترک موالات کو ایک خیالی اور طفلانہ تجویز سمجھ کر خود ہی مسترد کر دے گا، کیونکہ اس تحریک کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا کہ تمام ملک میں عام بدامنی سیاسی اضطراب اور ان لوگوں کی جن کا ملک سے مفاد وابستہ ہے، تباہی کے اسباب پیدا ہو جائیں۔ اس لئے کہ اس تحریک کے مخاطب یا تو جاہل تھے یا متعصب اور اس کے مقصد میں تعمیری ذہنیت کا فقدان تھا۔

جنوری اور پھر جون سنہ ۱۹۲۱ء میں اس حکمت عملی کی مزید توثیق کی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی مقامی حکومتوں پر زور ڈالا گیا کہ وہ تمام خطرناک

انقلاب پسند اشخاص کے خلاف کارروائی اور عام طور سے قانون کے نفاذ کی کوشش کریں، صحیح شکایات کو دور کرنے کے لئے، اصلاحی قانون بنائیں، اور اس تحریک کے خلاف تبلیغ و اشاعت کا سامان کریں۔ جدید وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے مئی میں یعنی اپنے ہندوستان میں آنے کے تقریباً چھ ہفتے بعد دو مرتبہ مہاتما گاندھی سے طویل ملاقاتیں کیں۔ اس کے بعد ہی علی برادران نے اپنی حال کی تقریروں کے لہجہ کے متعلق معافی چاہی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ حتمی وعدہ کیا کہ جب تک ان کا تعلق گاندھی جی کی تحریک سے رہے گا، اس وقت تک نہ وہ فساد کی حمایت کریں گے، اور نہ فسادات کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرینگے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ لارڈ ریڈنگ نے ولیعہد برطانیہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دینے کا گاندھی جی کے ملاقات کے بعد ہی فیصلہ کیا۔ آخر جولائی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے پنڈت مدن موہن مالویہ اور دوسرے اراکین کی مخالفت کے باوجود شاہی سیاحت کے مقاطعہ کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۲۱ء کی ابتدا صوبجات متحدہ میں کاشتکارانہ ہنگاموں اور طویل ہڑتالوں سے ہوئی جن میں وقتاً فوقتاً فسادات تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ اور انقلابی کارکنوں نے اس موجودہ معاشی بے چینی سے فائدہ اٹھانے اور قومی منافرت کے جذبات مشتعل کرنے کی پوری کوشش کی۔ ابتدا موسم گرما میں محض اس غرض سے کہ آسام کے یوروپی کاشتکاران چائے کو تباہ و برباد کر دیا جائے، ان چائے کے باغوں کے ہزاروں قلیوں میں انتشار پیدا کر دیا گیا، (اور اس کے بعد ان کو نہایت افسوسناک حالت میں ان کی قسمت پر چھوڑ دیا گیا) اور اس کے ساتھ ہی آسام بنگال ریلوے میں ہڑتال کرادی گئی۔ آگے چلکر موسم گرما میں ولایتی کپڑوں اور شراب کی دکانوں کا مقاطعہ نہایت زور کے ساتھ شروع کیا گیا۔ (ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض حصص ملک میں موخر الذکر کارروائی منشیات سے بچنے کے صحیح جذبات پر مبنی تھی، لیکن اس کا مقصد حکومت کو آمدنی آبکاری سے

محروم کرنا بھی تھا) ان مقاصد کے لئے جو ذریعہ اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ رضاکاروں کی انجمنوں کے ذریعے سے وو کانوں پر پہرا دیا جاتا تھا اور لوگوں کو بہکایا جاتا تھا۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک جدید اضطراب انگیز عنصر کا اضافہ، وسط پنجاب کے سکھوں میں خوفناک منافرت کے پیدا ہونے سے ہوا۔ فروری میں ننکانا صاحب میں اکالی دل کے ۱۵۰ سے زیادہ سکھ ایک مشہور سکھ گردوارہ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں نہایت بے رحمی سے قتل کئے گئے تھے، اس کے متعلق اس غلط خیال کو پھیلا کر کہ یہ سرکاری حکام کی سازش کا نتیجہ ہے، حکومت سے دشمنی پیدا کرانے کی کوشش کی گئی۔ اس تحریک میں جو تحریک ترک موالات سے بہت ملتی ہوئی تھی، سیاسی اور مذہبی مسائل کو ملا کر اس طرح ایک کر دیا گیا تھا کہ حکومت کے لئے یہ بہت مشکل ہو گیا، کہ وہ سکھوں کے دو مقابل فرقوں کے مذہبی اختلاف میں حصہ لینے کے الزام سے بچتے ہوئے اس پر قابو پا سکے۔

خریف سنہ ۱۹۲۱ء میں حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ شاہزادہ ویلز کی آمد پر ہندوستان میں جو ہڑتال ہوئی تھی، اس نے آبادی کے وفادار عنصر کی بے اثری اور انقلابی جماعت کی ملک پر مضبوط گرفت کو سب سے زیادہ واضح طریقہ سے ظاہر کر دیا۔ آخر اس کے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ حکومت نے اپنی پچھلی حکمت عملی کو چھوڑ دیا، اور اس کے مقابلہ میں سخت کارروائی کے لئے آگے بڑھی۔ اس سے پہلے ہی یکم نومبر کو علی برادران اور بعض دوسرے خلافتی رہنماؤں کو اس وجہ سے سزا مل چکی تھی کہ انھوں نے مجلس خلافت کی مرکزی مجلس عاملہ میں ایک ایسی تجویز کی منظوری میں حصہ لیا تھا جو مسلمان سپاہیوں کی وفاداری میں نقص پیدا کر سکتی تھی۔ شہزادہ کے ساحل بمبئی پر اترنے کے ساتھ سخت ترین فساد شروع ہو گیا ۵۳ آدمی قتل، اور ۴۰۰ زخمی ہوئے، اس کے چند دنوں بعد متعدد مقامی حکومتوں نے تعزیرات فوجداری کے ترمیمی قانون کے حصۂ دوم کے

ماتحت) رضا کاروں کی ایسی مجالس کو جو انقلابی تحریک میں شریک ہوں، خلاف قانون قرار دیدیا، اور مقامی رہنما جن میں سی۔آر۔داس، موتی لال نہرو، اور لالہ لاجپت رائے بھی شامل تھے، گرفتار کر لئے گئے،

رہا اس تحریک کے روح رواں مہاتما گاندھی کا معاملہ، سو حکومت اب تک ان کے متعلق اپنے ہاتھ کو روکے ہوئے تھی اگرچہ گاندھی جی عدم تشدد کا وعظ کہتے رہے، لیکن وہ ملک کے مختلف حصص میں مسلسل دراز دستیوں کو نہ روک سکے[1]۔ انھوں نے اس وقت تک تحریک ترک موالات کے لائحۂ عمل کی ان دفعات کو عملی جامہ پہنایا تھا جن کا لازمی نتیجہ فساد تھا، مثلاً پولیس اور فوج میں بددلی پیدا کرنا، اور لگان نہ ادا کرنے کی تحریک بمبئی کے مہلک ہنگاموں کے بعد جن میں گاندھی جی نے نہایت ہمت سے قیام امن میں حکومت کا ساتھ دیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو تنبہ ہو گیا ہے۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں ایک گول میز کانفرنس کے متعلق بہت زوروں سے بحث ہو رہی تھی، لیکن یہ سعی مصالحت ناکام ثابت ہوئی۔ اسی مہینہ میں احاطۂ مدراس کے ضلع گنٹور میں عدم ادائگی لگان کی تحریک پہلے پہل ایک حد تک وسیع پیمانہ پر شروع کی گئی، اور فروری کے ابتدا میں خود گاندھی جی نے یہ بات طے کی، کہ اسی قسم کی تحریک بمبئی پریسیڈنسی کے ضلع سورت کی ایک تحصیل یعنی (بردولی) میں شروع کریں۔ اب حکومت نے یہ طے کر لیا کہ انھیں گرفتار کرنا ضروری ہے، اس مرتبہ ان کے پیروؤں نے صوبجات متحدہ میں چوری چورا کے مقام پر جو زیادتیاں کیں، اور رضا کاران کانگرس کے ہجوم نے ایک پوری جماعت کو جس میں دو سب انسپکٹر بھی شامل تھے جس بے رحمی سے قتل کر ڈالا، ان کی وجہ سے گاندھی جی کو اپنی کارروائی ایک مرتبہ پھر ملتوی کر دینا پڑی اور حکومت نے بھی ایک مرتبہ پھر اس بات کا

---

[1] ۱۰؍جنوری ۱۹۲۲ء کو گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کے رکن داخلی نے جمعیت مقننہ میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ گزشتہ بارہ مہینوں کے اندر ملکی حکام نے، ۱۴ مرتبہ افواج ہند سے امداد طلب کی ہے۔

فیصلہ کر لیا۔ کہ ان کی گرفتاری سے پہلے وہ واقعات کی رفتار کا مطالعہ کرے۔ بہت ممکن ہے کہ گاندھی جی اس بات کے یقین کے بعد کہ ان کی تحریک بدامنی کی طرف بڑھ رہی ہے، اس بات کو ترجیح دیتے کہ مزید کارروائی ملتوی کر کے ایک مرتبہ پھر از سر نو تمام زمین تیار کی جائے اور یہ بھی بہت ممکن ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے پہلی مارچ کو جو یہ فیصلہ کیا کہ تمام قانون شکنی کے مستقلاً ترک کرنے کا کوئی خیال نہیں ہے، اس کی انھوں نے نہایت بددلی سے تاکید کی ہو، لیکن جوں ہی اس فیصلہ اور اس فیصلہ کے ساتھ مسٹر گاندھی کے اتفاق رائے کی خبر موصول ہوئی، ان کی گرفتاری کے لئے ہدایات جاری کر دی گئیں۔

گاندھی جی پر قانون تعزیرات ہند کے اس جرم کے ماتحت مقدمہ چلایا گیا کہ انھوں نے "برطانوی ہندوستان میں قانوناً قائم شدہ حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے" انھوں نے اقبال جرم کیا اور کہا کہ "میں اس عدالت کے سامنے یہ بات پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ موجودہ نظام حکومت کے خلاف نفرت کی تبلیغ میری فطرت ثانیہ بن گئی ہے" جج نے کہا کہ گاندھی جی کے افعال ایسے ہیں کہ خواہ کوئی بھی حکومت ہوتی وہ انھیں ہرگز آزاد نہ چھوڑتی اور یہ کہ "میں اس بات کو فراموش نہیں کرتا کہ آپ نے فسادات کے خلاف مسلسل اظہار خیال کیا ہے اور میں اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار ہوں، کہ آپ نے متعدد بار فسادات کو روکا بھی ہے، لیکن آپ کی سیاسی تعلیم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اور جن کو یہ تعلیم دی جاتی ہے ان کی فطرت کا خیال رکھتے ہوئے، یہ بات میرے ادراک سے باہر ہے، کہ آپ اس بات پر کس طرح یقین کر سکتے ہیں کہ اس کا لازمی نتیجہ فساد نہ ہوگا" بہر حال مہاتما گاندھی کو چھ سال کی سزائے محض ہو گئی، اور جج نے سزا دیتے ہوئے کہا کہ "اگر ہندوستان کے واقعات کی رفتار ایسی ہو جائے جس کی وجہ سے اس میعاد میں کمی ہو جائے اور آپ آزاد ہو جائیں تو شاید مجھ سے زیادہ اس سے کوئی خوش نہ ہوگا۔"

گاندھی جی کے میدان سیاسیات سے ہٹ جانے سے طوفان فسادات میں اضافہ کی جگہ سیاسی بار پیما میں اس کے بالکل برعکس علامات ظاہر ہوئیں۔ حکام کی سخت کارروائیوں کی وجہ سے صورت حال بہت کچھ درست ہوگئی۔ ان حالات میں صوبجات متحدہ اور بہار کے بعض حصص میں مسلسل اور سخت ترین بے اطمینانی، سکھوں کی بعض جماعتوں میں مستحکم انقت قانون کا جذبہ (اگرچہ اس سلسلہ میں بھی صورت حال بہتر ہوگئی) اور ہندوستان کے سب سے بڑے ریلوے نظام ایسٹ انڈیا ریلوے میں عظیم الشان ہڑتال، ایسی چیزیں تھیں، جو بہت تشویش ناک تھیں، لیکن اس کے ساتھ ہی مصری آزادی کے تسلیم کر لینے اور ترکی کے ساتھ اطمینان بخش سمجھوتے کے وعدہ سے مسلم جذبات کچھ ساکت نہیں ہوئے اور اس کے ساتھ ہی موسم بہار کی فصل معاشی صورت حال کے بہتر بنانے میں کچھ نہ کچھ ممد و معاون ضرور ہوئی۔

میں اس بات کو اس سے بہتر طریقہ سے ختم نہیں کر سکتا کہ ان الفاظ کو جو ۱۴ر فروری ۱۹۲۲ء کو دارالعوام میں معاملات ہند پر مباحثہ کے وقت مسٹر مانٹیگو کی زبان سے نکلے نقل کر دوں۔ برطانوی حکومت کی حیثیت کو بتلاتے ہوئے انھوں نے کہا:

"ہماری حکمت عملی یہ ہے، کہ ہم برطانوی سلطنت کے استحکام کو قائم رکھتے ہوئے اس سلطنت کے اندر کامل خود مختارانہ حکومت کے حصول کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں میرا خیال ہے، کہ مجھے اس حکمت عملی کے متعلق کچھ کہنا چاہئیے، کیوں کہ ہندوستان کے موجودہ مجالس مقننہ اس کو اچھی طرح نہیں سمجھی ہیں۔ ملک معظم کی حکومت نے ۱۹۱۷ء میں اپنی حکمت عملی کا اعلان کر دیا تھا، اور بالآخر پارلیمنٹ نے قانون حکومت ہند" کو منظور کر کے اس کے مطابق عمل کیا ہے ...... یہ صحیح ہے کہ جس وقت یہ قانون منظور کیا گیا تھا، تو اس کا مقصد محض دستوری ارتقا تھا اور اسی لئے اسے حکومت خود اختیاری کی مزید قسطوں کی طرف پہلے قدم

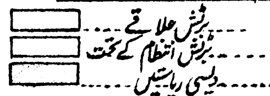
سے تعبیر کیا گیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات اسی وقت واضح کر دی گئی تھی، اور اب میں پھر اسے صاف کر دینا چاہتا ہوں، کہ مزید اقساط پارلیمنٹ کے اس اطمینان پر موقوف ہیں، کہ جو پہلی قسط دی گئی ہے اس سے صحیح مصرف لیا گیا ہے، ہمارا معیار یہی قرار پایا ہے......"

"ہمارا یہی خیال تھا، اور ہماری یہی خواہش تھی اور اب بھی ہے، کہ اگر صورت حال بہتر ہوتی گئی، تو قدم آگے بڑھانا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کا یہ عزم مصمم ہے کہ اگر صورت حال میں ترقی نہیں ہوئی تو کوئی قدم آگے نہ بڑھایا جائے۔ میں اس وقت کسی فیصلہ کا طالب نہیں ہوں، لیکن میرا خیال ہے، کہ اگر میں تمام ہندوستانیوں کو، ان کو بھی جو اصلاحات پر عمل پیرا ہیں، اور ان کو بھی جو عمل پیرا نہیں ہیں، اپنے اس خیال سے آگاہ کر دوں تو میں حق بجانب ہوں گا کہ میرا عقیدہ ہے کہ جہاں تک اس ایوان کا تعلق ہے، اس معیار سے گریز نہیں کیا جائے گا۔ ملک معظم کی اعلیٰ ترین حمایت کے ماتحت حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کے لئے، ان کو نہ صرف انفراداً بلکہ اجتماعاً ان چیزوں کے لیے جو کہ حکومت خود اختیاری کے لئے ضروری ہیں، آمادگی ظاہر کرنا چاہیئے۔ یہ وہ باتیں ہیں، جو اس قانون کے منظور ہوتے وقت اس ایوان میں بیان کی جا چکی ہیں یعنی رائے دہندوں میں سیاسی معاملات کے متعلق تعلیم و دلچسپی پیدا کرنا، مخالفوں کے مقابلہ میں حفاظت و رواداری، اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ... کیونکہ اس میں ان تمام خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا جو فن حکومت میں مضمر ہیں، اور جس صورت سے بھی ہو، ہر قسم کی معاندانہ کارروائی کے مقابلہ میں قیام امن کے لئے جو کارروائی بھی ضروری ہو کرنا پڑے گی۔



ہندی شہنشاہی اور سیلون

سیاسی تقسیم (۱۹۱۵) نقشہ میں ظاہر کی گئی ہیں



افغانستان
کابل
ہیرات
قندھار
بلوچستان
کشمیر
سری نگر
پشاور
پنجاب
لاہور
ملتان
بہاولپور
تبت
دریائے برہمپتر
نیپال
ممالک متحدہ آگرہ و اودھ
بھوٹان
آسام
دہلی
راجپوتانہ
اجمیر
سندھ
کراچی
وسط ہند
بہار و اڑیسہ
بنگال
کلکتہ
اپر برما
برما
لوئر برما
رنگون
یانان
بنکاک
کاٹھیاواڑ
دیو (بندرگاہ)
دمن (بندرگاہ)
صوبہ متوسط
برار
بمبئی
حیدرآباد
گوا (بندرگاہ)
مدراس
میسور
ماہی (فرانسیسی)
پانڈیچری (فرانسیسی)
کاریکال (فرانسیسی)
کوچین
سیلون
کولمبو

میلوں کا پیمانہ

۰ ۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۴۰۰ ۵۰۰

صحتنامہ برطانوی ہند کا نظام سیاسی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۱۴	۸	سنہ ۱۸۵۲	سنہ ۱۸۵۳
۲۳	۱۶	خرانہ	خزانہ
۲۸	۲	بہبوی	بہبودی
۴۷	۱	جوب آب دہ	جواب دہ
۷۲	۹	سنہ ۱۱۱۵	سنہ ۱۹۱۵
۸۷	۸	باضالطہ	باضابطہ
"	۲۲	نیشنل	نیشنل
۹۴	حاشیہ	Inia	India
۱۰۷	۱۷	نوگورنر کیلئے	توگورنر کیلئے
۱۰۹	۴	بہی	یہی
۱۱۷	۱۹	نامزدگی نہ کیگئی ہو	نامزد نہ کیگئی ہو
"	۲۵	ہوخرالذکر	موخرالذکر
۱۲۴	۱۸	Whye	Whyte

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۱۲۸	۱۸	ختیارات	اختیارات
۱۴۴	حاشیہ	Indioniz-ation	Indianiz-ation
۱۴۸	۱۲	کے	کیئے
۱۵۰	۱	حلاقہ	علاقہ
۱۵۶	۳	یہ پیدا	پیدا
۱۵۷	۲۳	کہ اس	کر دیں
۱۶۲	۵	اصوٗ بہ مجلس	اصولاً یہ مجلس
۱۶۴	۱۵	توی حیثیت	قومی حیثیت
۱۶۶	۳۱	سنہ ۱۹۳۲	سنہ ۱۹۲۲
۱۶۷	۱۹	Ame	Axe
۱۷۷	۲۱	پنے استحقاقات	اپنے استحقاقات